رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۳۰

شوال المکرم ۱۳۷۰ھ　　جلد ۳۶　　عدد ۳

ماہنامہ

# ترجمان القرآن

مرتبہ

## سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے　　اس پرچہ کی قیمت بارہ آنے

# ترجمان القرآن

# فہرست مضامین


| جلد ۳۸ | رجب شعبان ۱۳۷۱ھ مطابق اپریل و مئی ۱۹۵۲ء | عدد ۱، ۲ |
|---|---|---|





سید ابوالخیر مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اشارات

پاکستان میں دستورِ مملکت کی تدوین جس سست رفتاری کے ساتھ ہو رہی ہے، اور آج تک اس کام میں جس حیرت انگیز تساہل سے کام لیا جا رہا ہے، اس نے بالآخر مملکت کے عوام اور خواص سب کو بے چین کر دیا ہے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں یہ نئی مملکت قائم ہوئی۔ ضرورت تھی کہ اس کی دستور ساز اسمبلی کے پہلے ہی اجلاس میں اُن مقاصد کا اعلان کر دیا جاتا جن کے لیے مسلمانوں نے سابق مملکتِ ہند کا ایک حصہ کٹوا کر الگ کرایا تھا اور بے شمار قربانیاں دے کر ایک مستقل مملکت قائم کرائی تھی۔ مگر اعلانِ مقاصد کو مسلسل تعویق میں ڈالا گیا، حتیٰ کہ جب ملک کے گوشے گوشے سے تقاضوں کی بھرمار ہو گئی تب قیامِ مملکت کے پورے ۱۹ مہینے بعد ہماری مجلسِ دستور ساز نے یہ بتایا کہ وہ کن مقاصد اور اصولوں کو سامنے رکھ کر ملک کا دستور بنائے گی۔ پھر ایک مدتِ دراز اس انتظار میں گزر گئی کہ قراردادِ مقاصد کے تجویز کردہ خطوط پر دستور کا ڈھانچہ کب بنتا ہے۔ آخرکار مزید ۱۹ مہینے گزار دینے کے بعد چند نامکمل دستوری سفارشات ہمارے سامنے آئیں جنہیں دیکھ کر سارا ملک چیخ اُٹھا، کیونکہ اُن میں اُن مقاصد اور اصولوں کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا جن کی خوشنما جھلک قراردادِ مقاصد میں دکھائی گئی تھی۔ اس کے بعد غورِ مکرر کے وعدے پر پھر تعویق کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا جسے آج پورے ۲۰ مہینے ہو چکے ہیں اور وہ کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتا۔

سارا ملک اس پر حیران ہے کہ دورِ آزادی میں پانچ برس تک دورِ غلامی کا دستور، اور دورِ اسلام میں دورِ کفر کا دستور برقرار رہنے کے آخر کیا معنی ہیں! —— مگر اس پر صرف ایک گروہ مطمئن ہے، اور وہ وہی گروہ ہے جس کے سپرد بیک وقت دو کام کیے گئے تھے: اول یہ کہ ملک کے دورِ آزادی اور دورِ اسلام کا نیا دستور بنائے۔ دوم یہ کہ جب تک وہ نئے دستور کی تدوین سے فارغ نہ ہو اُس وقت تک دورِ غلامی اور دورِ کفر ہی کے دستور پر ملک کی حکومت چلاتا رہے۔

کیا یہ تعویق بے سبب ہے؟ —— اگر یہ بے سبب ہے تو عالمِ اسباب میں یہ پہلا خرقِ عادت ہے جو بلا سبب رونما ہوا ہے۔ ورنہ یہاں تو کوئی پتہ تک بے سبب جنبش نہیں کرسکتا۔

کیا یہ تعویق نااہلی کے سبب سے ہے؟ —— اگر یہ بات ہے تو دیانت اور شرافت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ لوگ جن کے سپرد تدوینِ دستور کا کام کیا گیا تھا، خود استعفٰی دے دیتے اور قوم کو موقع دیتے کہ وہ دوسرے جن لوگوں کو مناسب سمجھے اپنے ملک کا دستور بنانے کی خدمت تفویض کر دے۔

کیا یہ تعویق اس لیے ہے کہ اسلام کے دستوری اصولوں کو مشخص کرنا اور پھر ان پر دورِ جدید کی ایک ترقی پذیر مملکت کا دستور بنانا مشکل کام ہے؟ —— عذر یہی پیش کیا جاتا ہے۔ مگر جہاں تک اسلام کے دستوری اصولوں کی تشخیص کا تعلق ہے، یہ کام جنوری ۱۹۵۱ء میں تمام اسلامی گروہوں کے معتمد علیہ علماء کی ایک مجلس کراچی میں مجتمع ہو کر انجام دے چکی ہے۔ اور جہاں تک دستوری تفصیلات کا تعلق ہے، دستور ساز اسمبلی کے اپنے قائم کیے ہوئے ادارۂ تعلیماتِ اسلامیہ نے اپنی رپورٹوں میں وضاحت کے ساتھ یہ بتا دیا ہے کہ کونسی دستوری تفصیلات اسلام کے اصولوں سے مطابقت رکھتی ہیں اور کونسی نہیں رکھتیں۔ اس کے بعد اگر کچھ تفصیلات ایسی رہ جاتی ہیں جن کی خانہ پُری کرنے کی ضرورت ہے، تو وہ اسلامی نقطۂ نظر سے مباحات کے دائرے میں آتی ہیں جن کے لیے دنیا کے موجودہ دستوری طریقوں میں سے مناسب طریقے چھانٹ کر لے لینا کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے جو چند مہینوں میں انجام نہ دیا جا سکتا ہو۔ پس درحقیقت اس عذر کی حیثیت ایک عذرِ لنگ، ایک فریب سے زیادہ کچھ نہیں۔

---

پھر اس تعویق کا اصل سبب ہے کیا؟ —— علمِ غیب کا دعویٰ تو ہمیں نہیں ہے۔ مگر خدا کو دیکھا نہیں، عقل سے پہچانا ہے۔ عقل یہ کہتی ہے کہ اس کا اصل سبب وہ دو متضاد کام ہیں جو انگریز نے چلتے وقت ہماری دستور ساز اسمبلی کے سپرد کیے ہیں، یعنی یہ کہ ایک طرف وہی نیا دستور بھی بنائے، اور دوسری طرف وہی نیا دستور بننے تک دورِ غلامی اور دورِ کفر کے دستور پر مملکت کا کام بھی چلاتی رہے۔ اگرچہ ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی بھی اسی آزمائش میں ڈالی گئی تھی۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح اس سے بخیریت

گزر گئی۔ مگر ہمارے ہاں کے دستور سازوں نے اب تک یہی ثابت کیا ہے کہ ان کے اخلاق اس سخت آزمائش کا بوجھ نہیں سہار سکے۔

اس آزمائش کی مثال ایسی ہے جیسے ایک غاصب ایک خاندان کی جائداد اُگلنے پر جب مجبور ہو گیا تو چلتے وقت اس نے وہ جائداد اصل حقداروں کے حوالے کرنے کے بجائے چند ٹرسٹیوں کے حوالے کر دی اور ان سے کہہ دیا کہ تم ان لوگوں کے لیے ایک دستور العمل تیار کرنا جس کے مطابق یہ اس جائداد پر تصرف کریں، اور جب تک وہ دستور العمل تیار نہ ہو، اس وقت تک تم ہی اس جائداد پر اسی طریقہ سے تصرف کرتے رہنا جس طرح میں اپنے غاصبانہ تسلط کے زمانے میں کرتا تھا۔ اب اگر ٹرسٹی غیر معمولی طور پر امانت دار ہوں، یا مستحق خاندان والے اپنا حق وصول کرنے کے لیے کافی طاقتور ہوں تو بات دوسری ہے، ورنہ اس وقت عام طور پر انسانی اخلاق جیسے کچھ پائے جاتے ہیں، انہیں دیکھتے ہوئے ایک کمزور خاندان کے معاملے میں اگر کسی بات کی توقع کی جا سکتی ہے تو وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ٹرسٹی حضرات دستور العمل مرتب کرنے میں جتنا تساہل برت سکتے ہیں برتتے رہیں گے، تاکہ تصرف کی اُن آزادیوں سے متمتع ہوتے رہیں جو غاصب کو اپنے تسلط کے زمانے میں حاصل تھیں، اور پھر اس دوران میں تسمہ پا کی طرح اس خاندان کو اچھی طرح اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتے رہیں گے، تاکہ نیا دستور العمل جائداد کی سپردگی کے لیے نہیں بلکہ ٹرسٹ کی برقراری کے لیے بنایا اور بآسانی نافذ کیا جا سکے۔

یہی کچھ ہماری آنکھیں اس وقت ہوتے دیکھ رہی ہیں۔ اور غضب یہ ہے کہ ٹرسٹی کوئی باہر سے آئے ہوئے اجنبی لوگ نہیں ہیں، بلکہ خاندان ہی کے چند افراد ہیں!

---

اس جائداد میں غاصب کا دستورِ عمل کیا تھا؟ ۱۹۳۵ء کا ایکٹ اس کا شاہد ہے۔ اس ایکٹ کی رُو سے مالکانہ حقوق اور اختیارات خاندان کے لوگوں کو نہیں بلکہ خود غاصب کو حاصل تھے۔ اس میں اس امر کا کوئی ذکر تک نہ تھا کہ خاندان کے افراد کو بھی کچھ حقوق حاصل ہیں۔ اس میں خاندان والوں کو اگر کچھ اختیارات دیے بھی گئے تھے تو وہ اس حیثیت سے نہیں کہ یہ ان کے مالکانہ اختیارات ہیں، بلکہ صرف اس حیثیت سے کہ یہ مالک الملک کا عطیہ ہے جو دیا بھی جا سکتا ہے اور چھینا بھی جا سکتا ہے۔ اصل اختیارات کے حامل غاصب کے ایجنٹ (گورنر جنرل

اور گورنر) تھے نہ کہ خاندان کے اپنے چنے ہوئے نمائندے۔ جائداد کے کارکن ملازمین ان ایجنٹوں کے زیر حکم تھے نہ کہ نمائندگانِ خاندان کے۔ اور نمائندگانِ خاندان اس جائداد میں اگر کوئی تصرف کر سکتے تھے تو اسی وقت تک اور اسی حد تک کر سکتے تھے جب تک اور جہاں تک وہ غاصب کے ایجنٹوں کو پسند یا گوارا ہو، ورنہ وہ بیک بینی و دو گوش منصبِ اختیار سے بے دخل کیے جا سکتے تھے۔

پھر اس دستور العمل میں وہ سب آئینی گنجائشیں تو موجود تھیں جن سے فائدہ اٹھا کر اس مسلمان خاندان پر کافرانہ تہذیب، کافرانہ اخلاق اور کافرانہ طرزِ زندگی کے اصول اور طریقے مسلط کئے جا سکیں، مگر ایسی کوئی آئینی گنجائش موجود نہ تھی جس سے فائدہ اٹھا کر یہ خاندان خود اپنے اوپر اسلامی قوانین اور اسلامی طور طریقے نافذ کر سکتا یا کسی کافرانہ گندگی کو مسلط ہونے سے روک سکتا۔ بلکہ اس میں صریحاً ایسی دفعات موجود تھیں جو اسلامی احکام کے اجراء میں مانع تھیں۔

---

اگست ۱۹۴۷ء میں جب غاصب نے اپنا قبضہ اٹھایا تو ٹرسٹیوں کو بعینہٖ وہی مالکانہ حیثیت حاصل ہو گئی جو اس وقت تک غاصب کو حاصل تھی۔ خاندان کی طرف حقوقِ ملکیت کا انتقال نئے دستور العمل کی ترتیب تک ملتوی کر دیا گیا۔ بالفاظِ دیگر ۱۹۴۷ء کی آزادی دراصل خاندان کو نہیں بلکہ ٹرسٹیوں کو حاصل ہوئی تھی۔ اس آزادی کی برکات خاندان تک پہنچنی ابھی باقی ہیں۔

ٹرسٹیوں نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کو جوں کا توں اپنا دستور العمل بنا لیا۔ اس میں کوئی ایسی اصولی تبدیلی نہ کی جس سے آزادی و خود مختاری کی کم از کم کوئی ایک قسط ہی خاندان کی طرف منتقل ہو جاتی۔ بلکہ آج تک انہوں نے اس میں جتنی ترمیمات کی ہیں ان کا جائزہ لیجیے تو پتہ چل جائیگا کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں خود غاصب نے اپنے استبداد میں جس قدر تخفیف کر دی تھی اس کو بھی انہوں نے اڑا دینے اور زیادہ مستبدانہ اختیارات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

پھر انہوں نے اس ایکٹ میں ایسی بھی کوئی ترمیم نہ کی جس سے یہ مسلم خاندان اسلامی قوانین کے اجراء اور کافرانہ گندگیوں کے انسداد کی کوئی آئینی گنجائش پا سکتا اور وہ آئینی رکاوٹیں دور ہو جاتیں جو اس کام میں مانع ہیں۔

ان دونوں باتوں کا ثبوت ہم انشاء اللہ عنقریب ۱۹۳۵ء کے ایکٹ اور اس کی ان ترمیمات سے پیش کرینگے جو پچھلے پانچ سال میں دستور ساز اسمبلی نے کی ہیں۔

---

اس سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ ہمارے ان ٹرسٹیوں کو، جنہیں لموقت مالک الملک کی حیثیت حاصل ہے، یہ ۱۹۳۵ء کا ایکٹ کیوں پسند ہے، اور وہ نئے دستور العمل کو، جس کی رو سے لازماً انہیں حقوقِ ملکیت خاندان کی طرف منتقل کرنے پڑیں گے، کیوں تعویق میں ڈالے جا رہے ہیں۔

اس کے بعد ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس مسلسل تعویق سے جو وقت انہیں مل رہا ہے اسے وہ کس طرح استعمال کر رہے ہیں۔ ان کا نامۂ اعمال گواہ ہے کہ اس وقت کو انہوں نے استعمال کیا ہے:

فرنگی تہذیب کو اس کے تمام لوازم کے ساتھ فروغ دینے میں تاکہ جلدی سے جلدی پورا خاندان ان ٹرسٹیوں کے رنگ میں رنگ جائے۔

ہر قسم کی گمراہیوں اور ہر طرح کے مذہبی فتنوں کی ہمت افزائی کرنے میں تاکہ اسلام کے بارے میں لوگوں کے خیالات پوری طرح پراگندہ ہو جائیں اور لوگوں کے ذہن میں یہی امر مشتبہ ہو جائے کہ وہ اسلام، جس کے لیے پاکستان قائم ہوا تھا، فی الواقع ہے کیا چیز۔

معلومات کے تمام ذرائع پر کنٹرول کرنے میں تاکہ بیچارے خاندان کو پتہ ہی نہ لگے کہ اس کے ٹرسٹی کر کیا رہے ہیں۔

جائداد کا انتظام کرنے والے ملازموں کو غاصب کے دور سے بھی زیادہ ضمیر فروش اور بد دیانت بنانے میں، تاکہ جس طرح کل وہ غاصب کے آلۂ کار بنے ہوئے تھے اسی طرح اب ٹرسٹیوں کے آلۂ کار بن کر رہیں۔

خاندان کے دست و پا کو سیفٹی ایکٹ، سکیورٹی ایکٹ، پریس ایکٹ، اور فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز جیسے قوانین کے تسموں سے جکڑنے میں، تاکہ کوئی ٹرسٹیوں کے خلاف دم نہ مار سکے۔

انتخابات کا ایک ایسا نزالا ڈھنگ ڈالنے میں جس سے خاندان کی رائے اگر ۹۰ فیصدی بھی ٹرسٹیوں کے خلاف ہو جائے تب بھی انتخاب کے نتائج کم از کم ۸۰ – ۹۰ فیصدی ٹرسٹیوں ہی کے حق میں نکلتے رہیں۔

یہ تمام تدابیر جس وقت قابلِ اطمینان حد تک کامیاب ہو جائیں گی، ٹھیک وہی وقت ہوگا جب اس خاندان کے لیے وہ دستورِ موعود تیار ہو جائے گا جس کے تیار ہونے میں، کہا جاتا ہے کہ آج بڑی مشکلات حائل ہیں ــــ اور اس وقت انہی ٹرسٹیوں کی لمیٹڈ کمپنی اس جائداد کی اجارہ دار ہوگی۔ کیوں نہ ہو، آخر پاکستان قائم بھی تو انہی کی مساعی جمیلہ سے ہوا ہے۔

---

اس کا علاج بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ جس طرح ۱۹۴۸ء-۱۹۴۹ء میں نظام اسلامی کے لیے ایک پاکستان گیر مطالبہ پوری قوت کے ساتھ اٹھا تھا اور اسی کی بدولت یہ لوگ قرارداد مقاصد پاس کرنے پر مجبور ہوئے تھے، اسی طرح اب پھر تمام ملک سے دستورِ جدید کے لیے ایک متفقہ مطالبہ اٹھے۔ یہ مطالبہ کسی ایک گروہ کا نہیں بلکہ پورے ملک اور اس کے باشندوں کا ہونا چاہیے۔ یہ مطالبہ اس شان سے اٹھنا چاہیے کہ پاکستان کے در و دیوار سے بھی صدا اٹھے۔ اس مطالبے کے لیے ۱۹۵۲ء کے اختتام تک کی مہلت بالکل مناسب ہے کیونکہ یہ لوگ تین مہینے کم پانچ سال کی مہلت پہلے ہی پا چکے ہیں اور سال ختم ہونے میں ابھی ۹ مہینے سے زیادہ باقی ہیں۔ پھر مطالبہ صرف یہی نہ ہونا چاہیے کہ ملک کا نیا دستور بنایا جائے، بلکہ یہ بھی ہونا چاہیے کہ اس میں حسب ذیل امور کی قطعی صراحت ہو:

۱۔ ملک کا قانون اسلامی شریعت ہوگی۔

۲۔ کوئی ایسی قانون سازی نہ کی جا سکے گی جو شریعت کے احکام یا اصولوں کے خلاف ہو۔

۳۔ تمام ایسے قوانین کو منسوخ کیا جائیگا (خواہ بتدریج ہی سہی) جو شریعت کے احکام اور اصولوں سے متصادم ہوتے ہوں۔

۴۔ حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ اُن برائیوں کو مٹائے جنہیں اسلام مٹانا چاہتا ہے، اور اُن بھلائیوں کو فروغ دے جنہیں اسلام فروغ دینا چاہتا ہے۔

۵۔ لوگوں کے شہری حقوق (تحفظِ جان و مال و آبرو، آزادیِ تحریر و تقریر، آزادیِ اجتماع، اور آزادیِ نقل و حرکت) کو اُن کا جرم کھلی عدالت میں ثابت کیے بغیر، اور انہیں صفائی کا موقع دیے بغیر سلب نہ کیا جا سکے گا۔

۶۔ لوگوں کو حق ہوگا کہ انتظامیہ یا مقننہ اگر اپنے حدود سے تجاوز کرے تو وہ ملک کی عدالتوں سے چارہ جوئی کر سکیں۔

۷۔ عدلیہ انتظامی حکومت کی مداخلت سے آزاد ہوگی۔

۸۔ حکومت اس بات کی ضامن ہوگی کہ ملک میں کوئی شخص بنیادی ضروریاتِ زندگی (غذا، لباس، مکان، علاج اور تعلیم) سے محروم نہ رہے۔

اِن امور کی صراحت کے بغیر اگر کوئی دستور بنا بھی دیا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ اہلِ ملک کے کسی کام کا نہ ہوگا۔

# ضروری تصحیح

تفہیم القرآن جلد اول میں حسب ذیل مقامات پر اصلاح کر دی گئی ہے۔ جن اصحاب کے پاس پہلا ایڈیشن موجود ہے وہ بھی اپنے اپنے نسخوں کی اصلاح فرما لیں:

(۱) صفحہ ۱۵۸، سطر ۱۰-۱۱: "پھر جو کوئی دو دن پہلے واپس ہو گیا .... تب بھی کوئی مضائقہ نہیں"۔ اس عبارت کو بدل کر یوں کر دیا جائے:

"پھر جو کوئی جلدی کر کے دو ہی دن میں واپس ہو گیا تو کوئی حرج نہیں، اور جو کچھ زیادہ ٹھیر کر پلٹا تو بھی کوئی حرج نہیں"۔

نیز حاشیے میں موجودہ فقرہ "مکے کی طرف واپسی خواہ دو دن پہلے ہو یا دو دن بعد" یوں درست کر لیا جائے:

"مکے کی طرف واپسی خواہ دوسرے دن ہو یا تیسرے دن"۔

(۲) صفحہ ۲۲۰- حاشیہ نمبر ۳۲۷ پورا کاٹ کر یوں بنا دیا جائے:

"۱۰ اپنے مردوں میں سے، یعنی مسلمان مردوں میں سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاں گواہ بنانا آدمی کا اپنا اختیاری فعل ہو وہاں مسلمان کو چاہیے کہ صرف مسلمانوں ہی کو گواہ بنائے۔ البتہ غیر مسلم کے گواہ غیر مسلم بھی ہو سکتے ہیں"۔

(۳) صفحہ ۳۲۶، سطر ۱۸-۱۹: "اس سے یہ حکم آپ سے آپ نکل آیا کہ ...... شریک ہوں گے"۔

اس عبارت کو بدل کر یوں کر دیا جائے:

"لیکن اگر میت کا صرف ایک لڑکا ہو تو اس پر اجماع ہے کہ وہ دوسرے وارثوں کی غیر موجودگی میں کل مال کا وارث ہوگا، اور دوسرے وارث موجود ہوں تو ان کا حصہ دینے کے بعد باقی سب مال اسے ملے گا"۔

(۴) صفحہ ۴۷۰، سطر ۱۵- لا تقطع کے بجائے لا قطع۔

(۵) فہرست موضوعات میں بعض صفحات کے نمبر غلط درج ہو گئے ہیں، ان کو یوں درست کر لیا جائے:

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| صفحہ ۶۵۹ | کے بجائے ۶۵۷ | صفحہ ۶۵۸ | کے بجائے ۶۶۰ | صفحہ ۶۶۱ | کے بجائے ۶۶۳ |
| " ۶۶۰ | " ۶۵۸ | " ۶۶۳ | " ۶۶۱ | " ۶۶۲ | " ۶۶۴ |
| " ۶۵۷ | " ۶۵۹ | " ۶۶۴ | " ۶۶۲ | ...... | ...... |

# ہدایات

(وہ تقریر جو امیر جماعت اسلامی پاکستان نے ۱۳ر نومبر ۵۱ء کو جماعت کے اجتماع عام منعقدہ کراچی کے آخری اجلاس میں کی تھی)

خطبہ مسنونہ کے بعد:

رفقائے عزیز! چار دن کے اجتماع کے بعد اب ہم لوگ ایک دوسرے سے رخصت ہو رہے ہیں جتنا کام اس اجتماع میں کرنا تھا، ہم کر چکے ہیں، اور ایک حد تک ہم اس کا جائزہ بھی اپنے اجتماعِ خاص میں لے چکے ہیں۔ اب رخصت ہونے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ اپنے رفقاء سے ـــ ارکان اور متفقین سب سے ـــ خطاب کر کے انہیں وہ ضروری ہدایات دے دوں جو آئندہ اس کام کو صحیح طریقے پر چلانے کے لئے مطلوب ہیں۔

**تعلق باللہ**

اولین چیز، جس کی ہدایت ہمیشہ سے انبیاء، اور خلفاء راشدین، اور صلحائے امت ہر موقع پر اپنے ساتھیوں کو دیتے رہے ہیں، وہ اللہ سے ڈرنے اور اس کی محبت دل میں بٹھانے اور اس کے ساتھ تعلق بڑھانے کی ہدایت ہے۔ میں نے بھی اسی کے اتباع میں ہمیشہ اپنے رفقاء کو سب سے پہلے یہی نصیحت کی ہے اور آئندہ بھی جب کبھی موقع ملے گا اِسی کی نصیحت کرتا رہوں گا۔ کیونکہ یہ وہ چیز ہے جس کو ہر دوسری چیز پر مقدم ہی ہونا چاہیے۔ عقیدے میں اللہ پر ایمان مقدم ہے۔ عبادت میں اللہ سے دل کا لگاؤ مقدم ہے۔ اخلاق میں اللہ کی خشیت مقدم ہے۔ معاملات میں اللہ کی رضا کی طلب مقدم ہے۔ اور فی الجملہ ہماری ساری زندگی ہی کی درستی کا انحصار اِس پر ہے کہ ہماری دوڑ دھوپ اور سعی و جہد میں رضائے الٰہی کی مقصودیت ہر دوسری غرض پر مقدم ہو۔ پھر خصوصیت کے ساتھ یہ کام، جس کے لئے ہم ایک جماعت کی صورت میں اٹھے ہیں، یہ تو سراسر تعلق باللہ ہی کے بل پر چل سکتا ہے یہ اُتنا ہی مضبوط ہو گا جتنا اللہ کے ساتھ ہمارا تعلق مضبوط ہو گا، اور یہ اُتنا ہی کمزور ہو گا جتنا، خدانخواستہ

اللہ کے ساتھ ہمارا تعلق کمزور ہو گا۔

ظاہر بات ہے کہ آدمی جو کام بھی کرنے اٹھتا ہے، خواہ وہ دنیا کا کام ہو یا دین کا، اس کی اصل محرک وہ غرض ہوتی ہے جس کی خاطر وہ کام کرنے اٹھا ہے، اور اس میں سرگرمی اُسی وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ اُس غرض کے ساتھ آدمی کی دلچسپی میں گہرائی اور گرمجوشی ہو۔ نفس کے لئے کام کرنے والا خود غرضی کے بغیر نفس پرستی نہیں کر سکتا، اور نفس کی محبت میں جتنی شدت ہوتی ہے، اتنی ہی سرگرمی کے ساتھ وہ اس کی خدمت بجا لاتا ہے۔ اولاد کے لئے کام کرنے والا اولاد کی محبت میں دیوانہ ہوتا ہے تب ہی وہ اپنے عیش و آرام کو اولاد کی بھلائی پر قربان کرتا ہے اور اپنی دنیا ہی نہیں، اپنی عاقبت تک اس غرض کے لئے خطرے میں ڈال دیتا ہے کہ اُس کے بچے زیادہ سے زیادہ خوشحال ہوں۔ قوم یا وطن کے لئے کام کرنے والا ملک و قوم کے عشق میں گرفتار ہوتا ہے تب ہی وہ قوم و ملک کی آزادی، حفاظت اور برتری کی فکر میں مالی نقصانات اٹھاتا ہے، قید و بند کی سختیاں جھیلتا ہے، شب و روز کی محنتیں صرف کرتا ہے، اور جان تک قربان کر دیتا ہے۔ اب اگر ہم یہ کام نہ اپنے نفس کے لئے کر رہے ہیں، نہ کوئی خاندانی غرض اس کی محرک ہے، نہ کوئی ملکی و قومی مفاد اس میں ہمارے پیش نظر ہے، بلکہ صرف ایک اللہ کو راضی کرنا ہمیں مطلوب ہے اور اُسی کا کام سمجھ کر ہم نے اسے اختیار کیا ہے، تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جب تک اللہ ہی سے ہمارا تعلق گہرا اور مضبوط نہ ہو، یہ کام کبھی نہیں چل سکتا، اور اس میں سرگرمی آ سکتی ہے تو اُسی وقت جبکہ ہماری ساری رغبتیں اعلائے کلمۃ اللہ کی سعی میں مرکوز ہو جائیں۔ اس کام میں جو لوگ شریک ہوں ان کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ ان کا تعلق اللہ سے بھی ہو، بلکہ ان کا تعلق اللہ سے ہی ہونا چاہیے۔ اسے تعلقات میں سے ایک تعلق نہیں، بلکہ ایک ہی اصلی اور حقیقی تعلق ہونا چاہیے۔ اور انہیں ہر وقت یہ فکر دامنگیر رہنی چاہیے کہ اللہ سے اُن کا تعلق گھٹے نہیں بلکہ روز بروز زیادہ بڑھتا اور گہرا ہوتا چلا جائے۔

اِس معاملہ میں ہمارے درمیان دو رائیں نہیں ہیں کہ تعلق باللہ ہی ہمارے اِس کام کی جان ہے۔ جماعت کا کوئی رفیق، الحمد للہ کہ اس کی اہمیت کے احساس سے غافل نہیں ہے۔ البتہ جو سوالات اکثر لوگوں کو پریشان رکھتے ہیں وہ یہ ہیں کہ تعلق باللہ سے ٹھیک مراد کیا ہے؟ اس کو پیدا کرنے اور بڑھانے کا طریقہ کیا

ہے ؟ اور آخر ہم کس طرح یہ معلوم کریں کہ ہمارا تعلق واقعی اللہ سے ہے یا نہیں اور ہے تو کتنا ہے ؟ ان سوالات کا کوئی واضح جواب معلوم نہ ہونے کی وجہ سے مَیں نے اکثر یہ محسوس کیا ہے کہ لوگ گویا اپنے آپ کو ایک بے نشان صحرا میں پا رہے ہیں جہاں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ان کی منزل مقصود ٹھیک کس سمت میں ہے، اور کوئی اندازہ نہیں ہوتا کہ انہوں نے کتنا راستہ طے کیا اور اب کس مرحلے میں ہیں اور آگے کتنے مراحل باقی ہیں۔ اسی وجہ سے بسا اوقات ہمارا کوئی رفیق مبہم تصورات میں گم ہونے لگتا ہے، کوئی ایسے طریقوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے جو موصل الی المقصود نہیں ہیں، کسی کے لئے مقصود سے قریب کا تعلق اور دور کا تعلق رکھنے والی چیزوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو رہا ہے، اور کسی پر حیرت کا عالم طاری ہے۔ اس لئے آج مَیں صرف تعلق باللہ کی نصیحت ہی پر اکتفا نہ کروں گا بلکہ اپنے علم کی حد تک ان سوالات کا بھی ایک واضح جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

**تعلق باللہ کے معنی** تعلق باللہ سے مراد، جیسا کہ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے، یہ ہے کہ آدمی کا جینا اور مرنا اور اس کی عبادتیں اور قربانیاں سب کی سب اللہ کے لئے ہوں:

اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

اور وہ پوری طرح یکسو ہو کر، اپنے دین کو بالکل اللہ کے لئے خالص کر کے، اس کی بندگی کرے:-

وَمَا اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر اپنے ارشادات میں اس تعلق کی ایسی تشریح فرما دی ہے کہ اسکے مفہوم و مدعا میں کوئی ابہام باقی نہیں رہا ہے۔ حضورؐ کے بیانات کا تتبع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلق باللہ کے معنی ہیں خَشْیَۃَ اللّٰہِ فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَۃِ، "کھلے اور چھپے ہر کام میں اللہ کا خوف محسوس کرنا" اور یہ کہ اَنْ تَکُوْنَ بِمَا فِیْ یَدَیِ اللّٰہِ اَوْثَقَ بِمَا فِیْ یَدَیْکَ، "اپنے ذرائع و وسائل کی بہ نسبت تیرا بھروسہ اللہ کی قدرت پر زیادہ ہو" اور یہ کہ مَنِ الْتَمَسَ رِضَی اللّٰہِ بِسَخَطِ النَّاسِ، "آدمی اللہ کو راضی کرنے کے لئے لوگوں کو ناراض کر لے" جس کے بالکل برعکس حالت یہ ہے کہ آدمی لوگوں کو راضی کرنے کے لئے اللہ کی ناراضی مول لے، مَنِ الْتَمَسَ رِضَی النَّاسِ بِسَخَطِ اللّٰہِ۔

پھر جب یہ تعلق بڑھتے بڑھتے اس حد کو پہنچ جائے کہ آدمی کی محبت اور دشمنی اور اس کا دینا اور روکنا جو کچھ بھی ہو اللہ کے لیے اور اللہ کی خاطر ہو، اور نفسانی رغبت و نفرت کی لاگ اس کے ساتھ لگی نہ ہے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے تعلق باللہ کی تکمیل کر لی:

مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَ اَبْغَضَ لِلّٰہِ وَ اَعْطٰی لِلّٰہِ وَ مَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ

پھر یہ جو آپ ہر روز رات کو اپنی دعائے قنوت میں پڑھتے ہیں، اس کا لفظ لفظ اُس تعلق کی نشان دہی کرتا ہے جو آپ کا اللہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس کے الفاظ پر غور کیجیے اور دیکھتے جائیے کہ آپ ہر رات اپنے اللہ کے ساتھ کس قسم کا تعلق رکھنے کا اقرار کیا کرتے ہیں:

اللّٰھم اِنّا نستعینک ونستھدیک ونستغفرک ونؤمن بک ونتوکل علیک ونثنی علیک الخیر کلہ۔ نشکرک ولا نکفرک، ونخلع ونترک من یفجرک۔ اللّٰھم ایاک نعبد، ولک نصلی ونسجد، والیک نسعٰی ونحفد۔ نرجو رحمتک ونخشٰی عذابک، ان عذابک الجد بالکفار ملحق۔

خدایا! ہم تجھ سے مدد مانگتے ہیں، تجھ سے رہنمائی طلب کرتے ہیں، تجھ سے معافی چاہتے ہیں، تجھ پر ایمان لاتے ہیں، تیرے ہی اوپر بھروسہ رکھتے ہیں، اور ساری تعریفیں تیرے ہی لئے مخصوص کرتے ہیں۔ ہم تیرے شکر گزار ہیں، کفرانِ نعمت کرنے والے نہیں ہیں۔ ہم ہر اُس شخص کو چھوڑ دیں گے جو تیری نافرمانی کرے۔ خدایا ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں، تیرے ہی لئے نماز پڑھتے اور سجدہ کرتے ہیں اور ہماری ساری دوڑ دھوپ تیری طرف ہی ہے۔ ہم تیری رحمت کے امیدوار ہیں اور تیرے عذاب سے ڈرتے ہیں، یقیناً تیرا سخت عذاب اُن لوگوں کو پہنچنے والا ہے جو کافر ہیں۔

پھر اسی تعلق باللہ کی تصویر اُس دعا میں پائی جاتی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تہجد کے لئے اُٹھتے وقت پڑھا کرتے تھے۔ اس میں آپ اللہ کو خطاب کر کے عرض کرتے ہیں:

اللّٰھم لک اسلمت وبک اٰمنت وعلیک توکلت والیک انبت

خدایا! میں تیرا ہی مطیع فرمان ہوا اور تجھی پر ایمان لایا اور تیرے ہی اوپر میں نے بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف

وبِكَ خاصمتُ واليكَ حاكمتُ ۔ میں نے رجوع کیا، اور تیری ہی وجہ سے میں لڑا اور تیرے ہی حضور اپنا مقدمہ لایا ۔

**تعلق باللہ بڑھانے کا طریقہ** یہ ہے ٹھیک ٹھیک نوعیت اُس تعلق کی جو ایک مومن کو اللہ سے ہونا چاہیئے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ اس تعلق کو پیدا کرنے اور بڑھانے کا طریقہ کیا ہے ۔

اُس کو پیدا کرنے کی صورت صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ آدمی سچے دل سے اللہ وحدہٗ لاشریک کو اپنا اور ساری کائنات کا مالک، معبود اور حاکم تسلیم کرے، الٰہیت کی تمام صفات اور حقوق اور اختیارات کو اللہ کے لئے مخصوص مان لے، اور اپنے قلب کو شرک کے ہر شائبے سے پاک کر دے۔ یہ کام جب آدمی کر لیتا ہے تو اللہ سے اس کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔

رہا اس تعلق کا نشو و نما، تو وہ دو طریقوں پر منحصر ہے۔ ایک فکر و فہم کا طریقہ، اور دوسرا عمل کا طریقہ۔

فکر و فہم کے طریقے سے اللہ کے ساتھ تعلق بڑھانے کی صورت یہ ہے کہ آپ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کی مدد سے اُن نسبتوں کو تفصیل کے ساتھ اور زیادہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھیں جو آپ کے اور خدا کے درمیان فطرۃً ہیں اور بالفعل ہونی چاہییں۔ اِن نسبتوں کا ٹھیک ٹھیک احساس و ادراک اور ذہن میں ان کا استحضار صرف اِسی طریقے سے ممکن ہے کہ آپ قرآن اور حدیث کو سمجھ کر پڑھیں اور بار بار اِس مطالعے کی تکرار کرتے رہیں، اور ان کی روشنی میں جو جو نسبتیں آپ کے اور خدا کے درمیان معلوم ہوں ان پر غور و فکر کرکے اور اپنی حالت کا جائزہ لے کر دیکھتے رہیں کہ ان میں سے کس کس نسبت کو آپ نے بالفعل قائم کر رکھا ہے، کہاں تک اس کے تقاضے آپ پورے کر رہے ہیں، اور کس کس پہلو میں کیا کمی آپ محسوس کرتے ہیں۔ یہ احساس اور یہ استحضار جتنا جتنا بڑھے گا، انشاء اللہ اسی تناسب کے ساتھ اللہ سے آپ کا تعلق بھی بڑھتے گا۔

مثال کے طور پر ایک نسبت آپ کے اور اللہ تعالٰے کے درمیان یہ ہے کہ آپ عبد ہیں اور وہ آپ کا معبود ہے۔ دوسری نسبت یہ ہے کہ آپ زمین پر اس کے خلیفہ ہیں اور اس نے اپنی بے شمار امانتیں آپ کے سپرد کر رکھی ہیں۔ تیسری نسبت یہ ہے کہ آپ ایمان لا کر اس کے ساتھ ایک بیع کا معاہدہ طے کر

چکے ہیں جس کے مطابق آپ نے اپنی جان و مال اس کے ہاتھ بیچی ہے اور اس نے جنت کے وعدے پر خریدی ہے۔ چوتھی نسبت آپ کے اور اس کے درمیان یہ ہے کہ آپ اس کے سامنے جواب دہ ہیں اور وہ آپ کا حساب صرف آپ کے ظاہر ہی کے لحاظ سے لینے والا نہیں ہے بلکہ آپ کی جملہ حرکات و سکنات، بلکہ آپ کی نیتوں اور ارادوں تک کا ریکارڈ اس کے پاس محفوظ ہو رہا ہے۔ غرض یہ اور دوسری بہت سی نسبتیں ایسی ہیں جو آپ کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان موجود ہیں۔ بس انہی نسبتوں کو سمجھنے، محسوس کرنے، یاد رکھنے اور ان کے تقاضے پورے کرنے پر اللہ کے ساتھ آپ کے تعلق کا بڑھنا اور قریب تر ہونا موقوف ہے۔ آپ جس قدر ان سے غافل ہوں گے اللہ سے آپ کا تعلق اتنا ہی کمزور ہوگا اور جس قدر زیادہ ان سے خبردار اور ان کی طرف متوجہ رہیں گے اسی قدر آپ کا تعلق گہرا اور مضبوط ہوگا۔

لیکن یہ فکری طریقہ اس وقت تک نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا، بلکہ زیادہ دیر تک نباہا بھی نہیں جا سکتا جب تک کہ عملی طریقے سے اس کو مدد اور قوت نہ پہنچائی جائے۔ اور وہ عملی طریقہ ہے احکامِ الٰہی کی مخلصانہ اطاعت، اور ہر اُس کام میں جان لڑا کر دوڑ دھوپ کرنا جس کے متعلق آدمی کو معلوم ہو جائے کہ اس میں اللہ کی رضا ہے۔ احکامِ الٰہی کی مخلصانہ اطاعت کا مطلب یہ ہے کہ جن کاموں کا اللہ نے حکم دیا ہے ان کو بادلِ نخواستہ نہیں بلکہ اپنے دل کی رغبت اور شوق کے ساتھ خفیہ اور علانیہ انجام دیں اور اس میں کسی دنیوی غرض کو نہیں بلکہ صرف اللہ کی خوشنودی کو ملحوظِ خاطر رکھیں۔ اور جن کاموں سے اللہ نے روکا ہے ان سے قلبی نفرت و کراہت کے ساتھ خفیہ اور علانیہ پرہیز کریں اور اس پرہیز کا محرک کوئی دنیوی نقصان کا خوف نہیں بلکہ اللہ کے غضب کا خوف ہو۔ یہ طرزِ عمل آپ کو تقوے کے مقام پر پہنچا دے گا۔ اور اس کے بعد دوسرا طرزِ عمل آپ کو احسان کی منزل پر پہنچائے گا، یعنی یہ کہ آپ دنیا میں ہر اُس بھلائی کو فروغ دینے کی کوشش کریں جسے اللہ پسند فرماتا ہے، اور ہر اُس بُرائی کو دبانے کی کوشش کریں جسے اللہ ناپسند فرماتا ہے، اور اِس کوشش میں جان، مال، وقت، محنت، اور دل و دماغ کی قابلیت، غرض کسی چیز کے قربان کرنے میں بھی بخل سے کام نہ لیں۔ پھر اس راہ میں جو قربانی بھی آپ کریں اس پر کوئی فخر آپ کے دل میں پیدا نہ ہو، نہ یہ خیال کبھی آپ کے دل میں آئے کہ آپ نے کسی پر احسان کیا ہے، بلکہ بڑی سے بڑی قربانی کر کے بھی آپ یہی

سمجھتے رہیں کہ آپ کے خالق کا جو حق آپ پر تھا وہ پھر بھی ادا نہیں ہو سکا ہے۔

**تعلق باللہ کی افزائش کے وسائل** اس طرزِ عمل کو اختیار کرنا درحقیقت کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ ایک نہایت دشوار گزار گھاٹی ہے جس پر چڑھنے کے لئے بڑی طاقت درکار ہے۔ اور یہ طاقت جن تدبیروں سے آدمی کے اندر پیدا ہو سکتی ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ **نماز**، نہ صرف فرض اور سنت، بلکہ حسب استطاعت نوافل بھی۔ مگر یاد رکھیئے کہ نوافل زیادہ سے زیادہ اخفاء کے ساتھ پڑھنے چاہییں تاکہ اللہ سے آپ کا ذاتی تعلق نشو و نما پائے اور اخلاص کی صفت آپ میں پیدا ہو۔ نفل خوانی کا، اور خصوصاً تہجد خوانی کا اظہار بسا اوقات ایک خطرناک قسم کا ریا اور کبر انسان میں پیدا کر دیتا ہے جو نفسِ مومن کے لئے سخت مہلک ہے۔ اور یہی نقصانات دوسرے نوافل اور صدقات اور اذکار کے اظہار و اعلان میں بھی پائے جاتے ہیں۔

۲۔ **ذکرِ الٰہی**، جو زندگی کے تمام احوال میں جاری رہنا چاہیے۔ اس کے وہ طریقے صحیح نہیں ہیں جو بعد کے ادوار میں صوفیا کے مختلف گروہوں نے خود ایجاد کئے یا دوسروں سے لئے، بلکہ بہترین اور صحیح ترین طریقہ وہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا اور صحابۂ کرام کو سکھایا۔ آپ حضور کے تعلیم کردہ اذکار اور دعاؤں میں سے جس قدر بھی یاد کر سکیں یاد کر لیں۔ مگر الفاظ کے ساتھ ان کے معانی بھی ذہن نشین کیجیے، اور معانی کے استحضار کے ساتھ ان کو وقتاً فوقتاً پڑھتے رہا کیجیے۔ یہ اللہ کی یاد تازہ رکھنے اور اللہ کی طرف دل کی توجہ مرکوز رکھنے کا ایک نہایت مؤثر ذریعہ ہے۔

۳۔ **روزہ**، نہ صرف فرض، بلکہ نفل بھی۔ نفل روزوں کی بہترین اور معتدل ترین صورت یہ ہے کہ ہر مہینے تین دن کے روزوں کا التزام کر لیا جائے، اور ان ایام میں خاص طور پر تقوے کی اس کیفیت کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے جسے قرآن مجید روزے کی اصل خاصیت بتلاتا ہے۔

۴۔ **انفاق فی سبیل اللہ**، نہ صرف فرض، بلکہ نفل بھی، جہاں تک آدمی کی استطاعت ہو۔ اس معاملہ میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اصل چیز مال کی وہ مقدار نہیں ہے جو آپ خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں، بلکہ اصل چیز وہ قربانی ہے جو اللہ کی خاطر آپ نے کی ہو۔ ایک غریب آدمی اگر اپنا پیٹ کاٹ کر خدا کی راہ

ہیں ایک پیسہ صرف کرے تو وہ اللہ کے ہاں اس ایک ہزار روپیہ سے زیادہ قیمتی ہے جو کسی دولت مند نے اپنی آسائشوں کا دسواں یا بیسواں حصہ قربان کرکے دیا ہو۔ اس کے ساتھ یہ بھی آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ صدقہ اُن اہم ترین ذرائع میں سے ہے جو تزکیۂ نفس کے لئے اللہ اور اس کے رسول نے بتائے ہیں۔ آپ اس کے اثرات کا تجربہ کرکے اس طرح دیکھ سکتے ہیں کہ ایک دفعہ اگر آپ سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو آپ صرف نادم ہونے اور توبہ کر لینے پر اکتفا کریں۔ اور دوسری مرتبہ اگر کسی لغزش کا صدور ہو تو آپ توبہ کے ساتھ خدا کی راہ میں کچھ صدقہ بھی کریں۔ دونوں حالتوں کا موازنہ کرکے آپ خود اندازہ کرلیں گے کہ توبہ کے ساتھ صدقہ آدمی کے نفس کو زیادہ پاک اور بُرے میلانات کے مقابلے کے لئے زیادہ مستعد کرتا ہے۔

یہ وہ سیدھا سادھا سلوک ہے جو قرآن اور سنت نے ہمیں بتایا ہے۔ اس پر اگر آپ عمل کریں تو ریاضتوں اور مجاہدوں اور مراقبوں کے بغیر ہی آپ اپنے گھروں میں اپنے بال بچوں کے درمیان رہتے ہوئے اور اپنے سارے دنیوی کاروبار انجام دیتے ہوئے، اپنے خدا سے تعلق بڑھا سکتے ہیں۔

**تعلق باللہ کو ناپنے کا پیمانہ**

اس کے بعد یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ہم کیونکر یہ معلوم کریں کہ اللہ کے ساتھ ہمارا تعلق کتنا ہے، اور ہمیں کیسے پتہ چلے کہ وہ بڑھ رہا ہے یا گھٹ رہا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اسے معلوم کرنے کے لئے آپ کو خواب کی بشارتوں اور کشف و کرامت کے ظہور، اور اندھیری کوٹھڑی میں انوار کے مشاہدے کا انتظار کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ اس تعلق کو ناپنے کا پیمانہ تو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے قلب ہی میں رکھ دیا ہے۔ آپ بیداری کی حالت میں اور دن کی روشنی میں ہر وقت اس کو ناپ کر دیکھ سکتے ہیں۔ اپنی زندگی کا، اپنے اوقات کا، اپنی مساعی کا اور اپنے جذبات کا جائزہ لیجیے۔ اپنا حساب آپ لے کر دیکھیے کہ ایمان لا کر اللہ سے بیع کا جو معاہدہ آپ کر چکے ہیں اسے آپ کہاں تک نباہ رہے ہیں؟ اللہ کی امانتوں میں آپ کا تصرف ایک امین ہی کا سا تصرف ہے یا کچھ خیانت بھی پائی جاتی ہے؟ آپ کے اوقات اور محنتوں اور قابلیتوں اور اموال کا کتنا حصہ خدا کے کام میں جا رہا ہے اور کتنا دوسرے کاموں میں؟ آپ کے اپنے مفاد اور جذبات پر چوٹ پڑے تو آپ کے غصے اور بے کلی کا کیا حال ہوتا ہے اور جب خدا کے مقابلے میں بغاوت ہو رہی ہو تو اسے دیکھ کر آپ کے دل کی کڑھن اور آپ کے غضب ور

بے چینی کی کیا کیفیت رہتی ہے؟ یہ اور دوسرے بہت سے سوالات ہیں جو آپ خود اپنے نفس سے کر سکتے ہیں اور اس کا جواب لے کر ہر روز معلوم کر سکتے ہیں کہ اللہ سے آپ کا کوئی تعلق ہے یا نہیں، اور ہے تو کتنا ہے، اور اس میں کمی ہو رہی ہے یا اضافہ ہو رہا ہے۔ رہیں بشارتیں اور کشوف و کرامات اور انوار و تجلیات؟ تو آپ ان کے اکتساب کی فکر میں نہ پڑیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اس مادّی دنیا کے دھوکا دینے والے مظاہر میں توحید کی حقیقت کو پا لینے سے بڑا کوئی کشف نہیں ہے۔ شیطان اور اس کی ذریت کے دلائے ہوئے ڈراووں اور لالچوں کے مقابلے میں راہ راست پر قائم رہنے سے بڑی کوئی کرامت نہیں ہے۔ کفر و فسق اور ضلالت کے اندھیروں میں حق کی روشنی دیکھنے اور اس کا اتباع کرنے سے بڑا کوئی مشاہدۂ انوار نہیں ہے۔ اور مومن کو اگر کوئی سب سے بڑی بشارت مل سکتی ہے تو وہ اللہ کو رب مان کر اس پر جم جانے اور ثابت قدمی کے ساتھ اس پر چلنے سے ملتی ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔

**ترجیح آخرت**

تعلق باللہ کے بعد دوسری چیز جس کی میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہر حال میں دنیا پر آخرت کو ترجیح دیجیے اور اپنے ہر کام میں آخرت ہی کی فوز و فلاح کو مقصود بنائیے۔

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ دائمی اور ابدی زندگی کا مقام آخرت ہے، اور دنیا کی اس عارضی قیام گاہ میں ہم صرف اس امتحان کے لیے بھیجے گئے ہیں کہ خدا کے دیے ہوئے تھوڑے سے سروسامان، تھوڑے سے اختیارات، اور گنے چنے اوقات و مواقع میں کام کر کے ہم میں سے کون اپنے آپ کو خدا کی جنت کا مستقل آباد کار بننے کے لیے موزوں ثابت کرتا ہے۔ یہاں جس چیز کا امتحان ہم سے لیا جا رہا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہم صنعتیں اور تجارتیں اور کمپنیاں اور سلطنتیں چلانے میں کیا کمالات دکھاتے ہیں، اور عمارتیں اور سڑکیں کیسی اچھی بناتے ہیں، اور ایک شاندار تمدن پیدا کرنے میں کتنی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ بلکہ سارا امتحان صرف اس امر کا ہے کہ ہم خدا کی دی ہوئی امانتوں میں خدا کی خلافت کا حق ادا کرنے کی کتنی قابلیت رکھتے ہیں۔ باغی اور خود مختار بن کر رہتے ہیں یا مطیع و فرمانبردار بن کر؟ خدا کی زمین پر خدا کی مرضی پوری کرتے ہیں یا اپنے نفس اور ارباب من دون اللہ کی؟ خدا کی دنیا کو خدائی معیار کے مطابق سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں یا بگاڑنے کی؟ اور

خدا کی خاطر شیطانی قوتوں سے کشمکش اور مقابلہ کرتے ہیں یا ان کے آگے سپر ڈال دیتے ہیں؟ جنت میں آدم و حوا علیہما السلام کا جو پہلا امتحان ہوا تھا وہ دراصل اسی امر میں تھا، اور آخرت میں جنت کی مستقل آبادی کے لئے نوعِ انسانی کے افراد کا جو انتخاب ہوگا وہ بھی اسی فیصلہ کن سوال پر ہوگا۔ پس کامیابی و ناکامی کا اصل معیار یہ نہیں ہے کہ امتحان دینے کے دوران میں کس نے تختِ شاہی پر بیٹھ کر امتحان دیا اور کس نے تختۂ دار پر، بعد کس کی آزمائش ایک سلطنتِ عظیم دے کر کی گئی اور کسے ایک جھونپڑی میں آزمایا گیا۔ امتحان گاہ کے یہ وقتی اور عارضی حالات اگر اچھے ہوں تو یہ فوز و فلاح کی دلیل نہیں، اور برے ہوں تو یہ خائب و خاسر رہ جانے کے ہم معنی نہیں۔ اصل کامیابی جس پر ہمیں اپنی نگاہ جمائے رکھنی چاہیے، یہ ہے کہ دنیا کی اس امتحان گاہ میں جس جگہ بھی ہم بٹھائے گئے ہوں اور جو کچھ بھی دے کر ہمیں آزمایا گیا ہو اس میں ہم اپنے آپ کو خدا کا وفادار بندہ اور اس کی مرضات کا متبع ثابت کریں تاکہ آخرت میں ہم کو وہ پوزیشن ملے جو خدا نے اپنے وفادار بندوں کے لئے رکھی ہے۔

حضرات! یہ ہے اصل حقیقت۔ مگر یہ ایسی حقیقت ہے جسے محض ایک دفعہ سمجھ لینا اور مان جانا کافی نہیں ہے بلکہ اسے ہر وقت ذہن میں تازہ رکھنے کی سخت کوشش کرنی پڑتی ہے، ورنہ ہر وقت اس کا امکان رہتا ہے کہ ہم آخرت کے منکر نہ ہونے کے باوجود دنیا میں اس طریقے پر کام کرنے لگیں جو آخرت کو بھول کر، دنیا کو مقصود بنا کر کام کرنے والوں کا طریقہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آخرت ایک غیر محسوس چیز ہے جو مرنے کے بعد سامنے آنے والی ہے۔ اس دنیا میں ہم اس کا اور اس کے اچھے برے نتائج کا ادراک صرف ذہنی توجہ ہی سے کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس دنیا ایک محسوس چیز ہے جو اپنی تلخیاں اور شیرینیاں ہر وقت ہمیں چکھاتی رہتی ہے، اور جس کے اچھے اور برے نتائج ہر آن ہمارے سامنے آ کر ہمیں یہ دھوکا دیتے رہتے ہیں کہ اصل نتائج بس یہی ہیں۔ آخرت بگڑے تو اس کی تھوڑی بہت تلخی ہمیں صرف ایک دل کے چھپے ہوئے ضمیر میں محسوس ہوتی ہے، بشرطیکہ وہ زندہ ہو۔ مگر دنیا بگڑے تو اس کی چبھن ہمارا رونگٹا رونگٹا محسوس کرتا ہے اور ہمارے بال بچے، عزیز اقارب، دوست آشنا، اور سوسائٹی کے عام لوگ، سب مل جل کر اسے محسوس کرتے اور کراتے ہیں۔ اسی طرح آخرت سنورے تو اس کی کوئی ٹھنڈک بجز ایک گوشۂ دل کے سوا کہیں محسوس نہیں

ہوتی، اور وہاں بھی صرف اس صورت میں محسوس ہوتی ہے جب کہ غفلت نے دل کے اس گوشے کو سن نہ کر دیا ہو۔ مگر اپنی دنیا کا سنوار ہمارے پورے وجود کے لیئے لذت بن جاتا ہے، ہمارے تمام حواس اس کو محسوس کرتے ہیں اور ہمارا سارا ماحول اس کے احساس میں شریک ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخرت کو بطور ایک عقیدے کے مان لینا چاہے بہت مشکل نہ ہو، مگر اسے اندازِ فکر اور اخلاق و اعمال کے پورے نظام کی بنیاد بنا کر زندگی بھر کام کرنا سخت مشکل ہے۔ اور دنیا کو زبان سے ہیچ کہہ دینا چاہے کتنا ہی آسان ہو، مگر دل سے اس کی محبوبیت اور خیال سے اس کی مطلوبیت کو نکال پھینکنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ کیفیت بڑی کوشش سے حاصل ہوتی ہے اور پیہم کوشش کرتے رہنے سے قائم رہ سکتی ہے۔

### فکر آخرت کی تربیت کے ذرائع

آپ پوچھیں گے کہ یہ کوشش ہم کیسے کریں اور کن چیزوں سے اس میں مدد لیں؟ میں عرض کروں گا کہ اس کے بھی دو طریقے ہیں۔ ایک فکری طریقہ، اور دوسرا عملی طریقہ۔

فکری طریقہ یہ ہے کہ آپ صرف اٰمنتُ بالیوم الآخر کہہ دینے پر اکتفا نہ کریں، بلکہ قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی عادت ڈالیں جس سے رفتہ رفتہ آپ کو آخرت کا عالم دنیا کے اس پردے کے پیچھے یقین کی آنکھوں سے نظر آنے لگے گا۔ قرآن کا شاید کوئی ایک صفحہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں کسی نہ کسی ڈھنگ سے آخرت کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔ جگہ جگہ آپ کو اس میں عالمِ آخرت کا نقشہ ایسی تفصیل کے ساتھ ملے گا کہ جیسے کوئی وہاں کا آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا ہو۔ بلکہ بہت سے مقامات پر تو یہ نقشہ کشی ایسے عجیب طریقے سے کی گئی ہے کہ پڑھنے والا تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ کو وہاں پہنچا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے اور بس اتنی کسر رہ جاتی ہے کہ اس مادی دنیا کا دھندلا سا پردہ ذرا سامنے سے ہٹ جائے تو آدمی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھ لے جو الفاظ میں بیان کیا جا رہا ہے۔ پس قرآن کو بالالتزام سمجھ کر پڑھتے رہنے سے بتدریج آدمی کو یہ کیفیت حاصل ہو سکتی ہے کہ اس کے ذہن پر آخرت کا خیال مسلط ہو جائے اور وہ ہر وقت یہ محسوس کرنے لگے کہ اس کی مستقل قیام گاہ موت کے بعد کا عالم ہے جس کی اُسے دنیا کی اس عارضی زندگی میں تیاری کرنی ہے۔

اس ذہنی کیفیت کو مزید تقویت حدیث کے مطالعہ سے حاصل ہوتی ہے جس میں بار بار زندگی بعد الموت کے حالات بالکل ایک چشم دید مشاہدے کی شان سے آدمی کے سامنے آتے ہیں، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کس طرح ہر وقت آخرت کے یقین سے معمور رہتے تھے۔

پھر اس کیفیت کو راسخ کرنے میں مزید مدد زیارتِ قبور سے ملتی ہے جس کی واحد غرض نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتائی ہے کہ آدمی کو اپنی موت یاد رہے اور وہ دنیا کی اس متاعِ غرور کے ساتھ مشغول رہتے ہوئے اس بات کو نہ بھول جائے کہ آخر کار اسے جانا وہیں ہے جہاں سب گئے ہیں اور رہند چلے جارہے ہیں۔ البتہ یہ خیال رہے کہ اس غرض کے لئے وہ مزارات سب سے کم مفید ہیں جنہیں آج بگڑے ہوئے لوگوں نے حاجت روائی و مشکل کشائی کے مراکز بنا رکھا ہے۔ ان کے بجائے آپ گور غریباں کی زیارت کر کے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، یا پھر بادشاہوں کے اُن عالیشان مقبروں کو دیکھ کر جن کے آس پاس کہیں کوئی حاجب و دربان ادب قاعدے سکھانے والا نہیں ہے۔

اس کے بعد عملی طریقے کو لیجئے۔ آپ کو دنیا میں رہتے ہوئے اپنی گھریلو زندگی میں، اپنے محلے اور اپنی برادری کی زندگی میں، اپنے حلقۂ احباب اور حلقۂ تعارف میں، اپنے شہر اور اپنے ملک کے معاملات میں، اپنے لین دین اور اپنی معاش کے کاموں میں، غرض ہر طرف ہر آن قدم قدم پر ایسے دوراہے ملتے ہیں جن میں سے ایک راستے کی طرف جانا ایمان بالآخرۃ کا تقاضا ہوتا ہے اور دوسرے کو اختیار کرنا دنیا پرستی کا تقاضا۔ ایسے ہر موقع پر پوری کوشش کیجئے کہ آپ کا قدم پہلے راستے ہی کی طرف بڑھے۔ اور اگر نفس کی کمزوری سے یا غفلت کی وجہ سے کبھی دوسرے راستے پر آپ چل نکلے ہوں، تو ہوش آتے ہی پلٹنے کی کوشش کیجئے، خواہ کتنے ہی دور پہنچ چکے ہوں۔ پھر وقتاً فوقتاً اپنا حساب لے کر دیکھتے رہیے کہ کتنے مواقع پر دنیا آپ کو کھینچنے میں کامیاب ہوئی، اور کتنی بار آپ آخرت کی طرف کھنچنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ جائزہ آپ کو خود ہی ناپ تول کر بتلا دیگا کہ آپ کے اندر فکرِ آخرت نے کتنا نشوونما پایا، اور ابھی کتنی کچھ کمی آپ کو پوری کرنی ہے۔ جس قدر کمی آپ خود محسوس کریں اُسے خود ہی پورا کرنے کی کوشش کریں۔ بیرونی مدد آپ کو زیادہ سے زیادہ بہم پہنچ سکتی ہے تو اس طرح پہنچ سکتی ہے کہ دنیا پرست لوگوں کو چھوڑ کر ایسے صالح لوگوں سے ربط ضبط بڑھائیں جو آپ کے علم میں دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والے ہوں۔ مگر یاد رکھیے کہ آج تک کوئی ذریعہ ایسا دریافت نہیں ہو سکا ہے جو آپ کے اندر خود آپ کی اپنی کوشش کے بغیر کسی صفت کو گھٹا سکے یا بڑھا سکے یا ایسی کوئی نئی صفت آپ میں پیدا کر سکے جس کا ملکہ آپ کی طبیعت

میں موجود نہ ہو۔

**بیجا پندار سے احتراز**

تیسری بات جس کی میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ پچھلے چند سال کی پیہم کوشش سے جو کچھ بھی اصلاح آپ کی انفرادی سیرت، آپ کے اجتماعی اخلاق، اور آپ کے جماعتی نظم میں رونما ہوئی ہے اس پر فخر کا جذبہ آپ کے دل میں ہرگز پیدا نہ ہو۔ آپ نہ فرداً فرداً، نہ من حیث الجماعت، کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں کہ ہم اب کامل ہو گئے ہیں، جو کچھ بننا تھا بن چکے ہیں، کوئی مزید کمال مطلوب ایسا نہیں رہا ہے جو ہمیں حاصل کرنا ہو۔

"مجھے اور جماعت کے دوسرے ذمہ دار لوگوں کو بسا اوقات ایک فتنے سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایک زمانے سے بکثرت لوگ جماعت اسلامی کی، اور در اصل اس تحریک کی جس کے لئے یہ جماعت کام کرنے اٹھی ہے، قدر گھٹانے کے لئے یہ مشہور کر رہے ہیں کہ یہ جماعت تو محض ایک سیاسی جماعت ہے، عام سیاسی پارٹیوں کی طرح کام کر رہی ہے، اس میں تزکیۂ نفس اور روحانیت کا کہیں نام و نشان تک نہیں ہے، اس میں تعلق باللہ اور فکر آخرت کا فقدان ہے، اس کے چلانے والے خود بے پیرے ہیں، نہ انہوں نے کسی سلسلۂ خانقاہی سے تقوے اور احسان کی تربیت پائی ہے نہ ان کے رفقاء کو اس طرح کی کوئی تربیت ملنے کا امکان ہے۔ یہ باتیں اس لئے کی جاتی ہیں کہ جماعتِ اسلامی کے کارکنوں میں اور اس سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں میں بددلی پھیلے اور وہ پھر پلٹ کر انہی آستانوں سے وابستہ ہو جائیں جہاں آج تک اسلام زیر سایۂ کفر کی کسی نہ کسی جزوی خدمت ہی کو بڑی سے بڑی چیز سمجھا جاتا رہا ہے، جہاں پورے دین کو بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے قائم اور غالب کرنے کا تخیل سرے سے موجود ہی نہیں رہا ہے، بلکہ جہاں یہ تخیل اگر پیش کیا بھی گیا ہے تو ہر طرح کی سخن سازیوں سے اس کو ایک غیر دینی تخیل ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اسے یوں مطعون کیا گیا ہے کہ گویا کفر و فسق کے مقابلے میں اسلام کو نظامِ غالب بنانے کی فکر سراسر ایک دنیا پرستانہ فکر ہے۔ اس حالت میں ہم کو مجبوراً خانقاہی تزکیۂ نفس اور اسلامی تزکیۂ نفس کا فرق واضح کرنا پڑتا ہے، اور یہ بتانا پڑتا ہے کہ وہ حقیقی تقوے اور احسان کیا ہے جو اسلام میں مطلوب ہے، اور وہ ٹکسالی تقوے اور احسان کیا چیز ہے جس کی تربیت ہمارے ملک میں دینداری کے ماہرین دیا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہمیں جماعت اسلامی کے طریقِ اصلاح و تربیت اور

اس کے نتائج بھی کھول کر بیان کرنے پر مجبور ہوں تاکہ ایک صحیح دینی حس رکھنے والا آدمی خود ہی محسوس کرے کہ جماعت اسلامی کا اثر قبول کرنے کے بعد ابتدائی مرحلے ہی میں انسان کے اندر تقوٰے اور احسان کی جو حقیقی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے وہ عمر بھر تزکیۂ نفس کی تربیت پاتے بلکہ تربیت دینے والوں میں بھی نظر نہیں آتی۔

یہ باتیں ہمیں مجبوراً اپنے معترضین کی بے انصافیوں کی وجہ سے کہنی پڑتی ہیں۔ اپنی مدافعت کے لئے نہیں بلکہ تحریکِ اسلامی کو بچانے کی خاطر کہنی پڑتی ہیں۔ لیکن انہیں کہتے وقت ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں کہ کہیں یہ باتیں ہمارے اندر اور ہمارے رفیقوں کے اندر عُجب و غرور، اور اپنی کاملیت کی غلط فہمی نہ پیدا کر دیں۔ اس لئے کہ اگر خدانخواستہ یہ جھوٹا پندار ہمارے اندر پیدا ہو گیا تو ہم نے آج تک جو کچھ حاصل کیا ہے وہ بھی کھو بیٹھیں گے۔

اس خطرے سے بچنے کے لئے میں چاہتا ہوں کہ تین حقیقتیں آپ اچھی طرح سمجھ لیں اور انہیں کبھی فراموش نہ کریں۔

پہلی بات یہ ہے کہ کمال ایک لامتناہی چیز ہے جس کی آخری حد ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ آدمی کا کام یہ ہے کہ پیہم اُس کی بلندیوں پر چڑھنے کی کوشش کرتا رہے اور کسی مقام پر بھی پہنچ کر یہ گمان نہ کرے کہ وہ کامل ہو گیا ہے۔ جس آن کسی شخص کو یہ غلط فہمی لاحق ہوتی ہے اس کی ترقی فوراً رک جاتی ہے اور رک ہی نہیں جاتی الٹا تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ یاد رکھیئے کہ بلندی پر چڑھنے ہی کے لئے نہیں، ایک بلند مقام پر ٹھیرنے کے لئے بھی ایک مسلسل جدوجہد درکار ہوتی ہے اور اس کا سلسلہ بند ہوتے ہی پستی کی کشش آدمی کو نیچے کھینچنا شروع کر دیتی ہے۔ ایک دانشمند آدمی کو کبھی نیچے جھک کر نہیں دیکھنا چاہیئے کہ وہ اوپر کتنا چڑھ چکا ہے۔ اُسے اوپر دیکھنا چاہیے کہ جو بلندیاں ابھی چڑھنے کے لئے باقی ہیں وہ اس سے کس قدر دور ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسلام نے ہمارے سامنے انسانیت کا اتنا بلند معیار رکھا ہے جس کی ابتدائی منزلیں بھی غیر اسلامی مذاہب و ادیان کے معیار کمال سے اونچی ہیں۔ اور یہ کوئی خیالی معیار نہیں ہے بلکہ عمل کی دنیا میں انبیاء کرام، اور اکابر صحابہ، اور صلحاء امت کی پاکیزہ زندگیاں اس کی بلندیوں کی

نشان دہی کر رہی ہیں۔ اس معیار کو آپ ہمیشہ نگاہ میں رکھیں۔ یہ آپ کو کاملیت کی غلط فہمی سے بچائے گا، اپنی پستی کا احساس دلائے گا، اور ترقی کی کوششوں کے لئے ہر وقت اتنی بلندیاں آپ کے سامنے پیش کرتا رہے گا کہ عمر بھر کی جدوجہد کے بعد بھی آپ یہی محسوس کریں گے کہ ابھی بہت سی منزلیں چڑھنے کے لئے باقی ہیں۔ اپنے گرد و پیش کے دم توڑتے ہوئے مریضوں کو دیکھ کر اپنی ذرا سی تندرستی پر ناز نہ کیجیے۔ اخلاق و روحانیت کے اُن پہلوانوں پر نگاہ رکھیے جن کی جگہ آج آپ شیطان سے نبرد آزما ہونے کے لئے اکھاڑے میں اترے ہیں۔ مومن کا کام یہ ہے کہ دولت دین کے معاملے میں وہ ہمیشہ اپنے سے اونچے لوگوں کی طرف دیکھے تاکہ یہ دولت کمانے کی حرص کبھی اس کے اندر بجھنے نہ پائے، اور دولتِ دنیا کے معاملے میں ہمیشہ اپنے سے کم تر لوگوں کی طرف دیکھے تاکہ جتنا کچھ بھی اس کے رب نے اسے دیا ہے اس پر وہ خدا کا شکر بجا لائے اور زر و مال کی پیاس تھوڑے ہی سے بجھ جائے[۱]۔

تیسری بات یہ ہے کہ فی الواقع ہماری جماعت نے اب تک اپنے اندر جو خوبیاں پیدا کی ہیں وہ بس

---

۱؎ ٹھیک یہی مضمون ہے ایک حدیث کا جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

من نظر فی دینہ الی من ھو فوقہ فاقتدی بہ، ونظر فی دنیاہ الی من ھو دونہ فحمد اللہ علی ما فضلہ اللہ علیہ، کتبہ اللہ شاکراً صابراً۔ ومن نظر فی دینہ الی من ھو دونہ ونظر فی دنیاہ الی من ھو فوقہ فاسف علی ما فاتہ منہ، لم یکتبہ اللہ شاکراً ولا صابراً۔

جس نے اپنے دین کے معاملہ میں اپنے سے اوپر والے کو دیکھا اور اس کی پیروی میں آگے بڑھا، اور اپنی دنیا کے معاملے میں اپنے سے کم تر کو دیکھا اور اللہ کے دیئے ہوئے فضل پر اس کا شکر ادا کیا، وہ اللہ کے ہاں شاکر اور صابر لکھا گیا۔ بخلاف اس کے جس نے اپنے دین کے معاملے میں اپنے سے کم تر کو اور دنیا کے معاملے میں اپنے سے اونچے کو دیکھا اور دنیا پانے میں جو کمی رہ گئی اس پر حسرت و اندوہ میں مبتلا ہوا، وہ اللہ کے ہاں نہ شاکر لکھا گیا نہ صابر۔

اس لئے خوب ہیں کہ ہمارے گرد و پیش کا بگاڑ حد سے بڑھا ہوا ہے۔ اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں ایک ذرا سا دیا بھی، جسے روشن کرنے کی توفیق ہم لوگوں کو نصیب ہوگئی، نمایاں نظر آنے لگا۔ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ اسلام کے کم سے کم معیار مطلوب کو بھی سامنے رکھ کر جب ہم اپنا جائزہ لیتے ہیں تو ہر پہلو سے ہمیں اپنی ذات میں اور اپنے جماعتی نظام میں خامیاں ہی خامیاں نظر آتی ہیں۔ پس اگر ہم اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کریں تو یہ محض ایک انکسار کے طور پر نہ ہو بلکہ ایک حقیقی اعتراف ہونا چاہیے اور اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنی ایک ایک کوتاہی کو سمجھیں اور اسے دور کرنے کی کوشش کریں۔

**تربیت گاہوں سے فائدہ اٹھایئے** اسی چیز میں آپ کی مدد کرنے کے لئے جماعت نے تربیت کے نئے پروگرام کا آغاز کیا ہے۔ اس پروگرام کے تحت جو تربیت گاہیں قائم کی گئی ہیں ان میں ارکان اور متفقین سب آسکتے ہیں۔ تربیت کی مدت قصداً کم رکھی گئی ہے تاکہ کاروباری لوگ اور ملازمین اور زراعت پیشہ حضرات، سب کے سب اس سے بآسانی فائدہ اٹھا سکیں۔ تربیت کے دو اجزاء رکھے گئے ہیں، ایک علمی اور دوسرا عملی۔ علمی جزء میں کوشش کی جاتی ہے کہ تھوڑے وقت ہی میں قرآن و حدیث کی تعلیمات، احکام فقہیہ، اور جماعتی لٹریچر کا ایک ضروری خلاصہ آدمی کے ذہن نشین ہو جائے جس سے وہ دین کو، اس کے پورے نظام کو، اس کے تقاضوں کو، اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے طریقوں کو، اور اس کی اقامت کے لائحۂ عمل کو اچھی طرح سمجھ لے، اور یہ بھی جان لے کہ اقامت دین کی اس سعی کے لئے کس قسم کی انفرادی سیرت، اور کس طرح کا جماعتی کردار مطلوب ہے۔ عملی جزء میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ چند روز تک ہمارے کارکن بیک وقت ایک جگہ رہ کر ایک ستھری اور پاکیزہ اسلامی زندگی بسر کرنے کی مشق کریں۔ ضبطِ اوقات کا، نظمِ عمل کا، حسنِ رفاقت کا، اور اخوت و محبت کا سبق سیکھیں۔ ایک دوسرے کی خوبیاں اپنے اندر جذب کریں۔ اپنی کوتاہیوں کو دور کرنے میں دوسروں سے مدد لیں۔ اور چند روز ہر طرح کی دنیوی مشغولیتوں سے منقطع ہو کر خالص اللہ کے لئے اپنی فکر اور توجہ اور معروفیت کو مرتکز رکھیں۔

ہماری دلی خواہش تھی کہ ایسی تربیت گاہیں کم از کم ہر ضلع میں قائم کی جائیں اور ہمہ وقت کام کرتی رہیں لیکن ابھی ہمارے پاس ایسے آدمیوں کی کمی ہے جو اس کام کو چلانے کے اہل ہوں، اور دوسرے ضروری

وسائل بھی کافی نہیں ہیں۔ اس لئے سردست صرف لاہور، راولپنڈی، ملتان، اور کراچی میں تھوڑی مدت کے لئے اس کا انتظام کیا گیا ہے۔ تاہم مجھے توقع ہے کہ اس تھوڑے سے انتظام کا بھی آپ کو بہت کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے انشاء اللہ اس کورس سے گزر کر آپ خود محسوس کرینگے کہ یہ ایک بڑا مفید پروگرام ہے جو جماعت نے شروع کیا ہے۔ میں تمام رفقاء سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔

**اپنے گھروں کی طرف توجہ کیجئے**

اس کے بعد میں آپ سب حضرات کو یہ بھی نصیحت کرتا ہوں کہ آپ اپنی اولاد کی اور اپنے گھر والوں کی اصلاح پر خاص توجہ دیں۔ قُوا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا۔ جس اولاد کے لئے اور جن بیویوں کے لئے آپ کو کھانے پینے اور پہننے کی فکر ہوتی ہے، ان کے لئے آپ کو سب سے بڑھ کر فکر اس بات کی ہونی چاہیے کہ وہ جہنم کا ایندھن نہ بننے پائیں۔ آپ کو اپنی حد تک ان کی عاقبت سنوارنے اور انہیں جنت کے راستے پر ڈالنے ہی کی کوشش کرنی چاہیے۔ پھر اگر خدانخواستہ ان میں سے کوئی خود بگڑے تو آپ بری الذمہ ہیں۔ بہر حال اس کی عاقبت خراب ہونے میں آپ کا کوئی حصہ نہ ہو۔ بسا اوقات میرے پاس اس طرح کی شکایتیں آتی رہتی ہیں کہ رفقاء جماعت اصلاح خلق کی جتنی فکر کرتے ہیں، اصلاح اہل و عیال اور اصلاح خاندان کی نہیں کرتے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے معاملے میں یہ شکایات درست ہوں اور بعض کے معاملے میں مبنی بر مبالغہ۔ فرداً فرداً ایک ایک شخص کے حال کی تحقیق میرے لئے مشکل ہے۔ اس لئے میں یہاں اس بارے میں ایک عام نصیحت پر اکتفا کرتا ہوں۔ ہم سب کی یہ تمنا ہونی چاہیے اور تمنا کے ساتھ کوشش بھی کہ دنیا میں جو ہمیں پیارے ہیں انہیں سلامتی کی راہ پر دیکھ کر ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۔

اس معاملے میں رفقاء کو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کی زندگی میں دلچسپی لیں اور نہ صرف اپنی اولاد کو، بلکہ اپنے رفقاء کی اولاد کو بھی سنوارنے میں حصہ لیں۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ایک بچہ اپنے باپ کا اثر قبول نہیں کرتا مگر اپنے باپ کے دوستوں کا اثر قبول کر لیتا ہے۔

**آپس کی اصلاح اور اس کا طریقہ**

میں آپ کو یہ نصیحت بھی کرتا ہوں کہ آپ اپنی اصلاح کے ساتھ آپس میں بھی ایک دوسرے کی اصلاح کریں۔ جو لوگ خدا کی خاطر کلمہ حق کی سربلندی کے لئے ایک جماعت

بنیں انہیں ایک دوسرے کا ہمدرد و مددگار اور غمخوار ہونا چاہیے۔ انہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنے مقصدِ عظیم میں کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کہ ان کی جماعت بحیثیت مجموعی اخلاق اور نظم کے لحاظ سے مضبوط نہ ہو۔ اور اس احساس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ سب ایک دوسرے کی تربیت میں مددگار بنیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کو سہارا دے کر خدا کی راہ میں آگے بڑھانے کی کوشش کرے۔ اسلام میں اجتماعی تزکیے کا طریقہ یہی ہے۔ میں گرتا نظر آؤں تو آپ دوڑ کر مجھے سنبھالیں اور آپ لغزش کھا رہے ہوں تو میں بڑھ کر آپ کا ہاتھ تھام لوں۔ میرے دامن پر کوئی دھبہ نظر آئے تو آپ اسے صاف کریں، اور آپ کا دامن آلودہ ہو رہا ہو تو میں اسے پاک کروں۔ جس چیز میں میری فلاح و بہتری آپ کو محسوس ہو اسے آپ مجھ تک پہنچائیں اور جس چیز میں آپ کی دنیا و عاقبت کی درستی مجھے محسوس ہو اسے میں آپ تک پہنچاؤں۔ مادّی دنیا میں جب لوگ ایک دوسرے سے لین دین کرتے ہیں تو مجموعی طور پر سب کی خوشحالی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اخلاق و روحانیت کی دنیا میں بھی جب یہ امداد باہمی اور داد و ستد کا طریقہ چل پڑتا ہے تو پوری جماعت کا سرمایہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

باہمی اصلاح کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جس شخص کی کوئی بات آپ کو کھٹکے، یا جس سے کوئی شکایت آپ کو ہو، اس کے معاملہ میں آپ جلدی نہ کریں، بلکہ پہلے اسے اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں۔ پھر اولین فرصت میں خود اس شخص سے مل کر تخلیہ میں اس سے بات کریں۔ اس پر اگر اصلاح نہ ہو اور معاملہ آپ کی نگاہ میں کچھ اہمیت رکھتا ہو تو اسے اپنے علاقے کے امیر جماعت کے نوٹس میں لائیں۔ وہ پہلے خود اصلاح کی کوشش کرے، اور پھر ضرورت ہو تو جماعت کے اجتماع میں اسے پیش کرے۔ اس پوری مدت میں اس معاملہ کا ذکر غیر متعلق لوگوں سے کرنا، اور شخصِ متعلق کی غیر موجودگی میں اس کا چرچا کرنا، صریحاً غیبت ہے جس سے قطعی اجتناب کرنا چاہیے۔ نیز ایسے معاملات میں مرکز کی طرف رجوع کرنا اس وقت تک صحیح نہیں ہے جب تک مقامی جماعت اصلاح کی سعی میں ناکام ہو کر مرکز سے مدد لینے کی ضرورت محسوس نہ کرے۔

**اجتماعی تنقید کا صحیح طریقہ** آپس میں ایک دوسرے کی غلطیوں اور کمزوریوں پر تنقید بھی اجتماعی اصلاح کا ایک مفید طریقہ ہے، مگر تنقید کے صحیح حدود اور آداب ملحوظ نہ رکھنے سے یہ سخت نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔

اس لئے میں وضاحت کے ساتھ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس کے حدود اور آداب کیا ہیں ۔

(۱) تنقید ہر وقت ہر صحبت میں نہ ہو، بلکہ صرف خصوصی اجتماع میں امیر جماعت کی تحریک پر، یا اس کی اجازت سے ہو ۔

(۲) تنقید کرنے والا اللہ کو شاہد سمجھ کر پہلے خود اپنے دل کا جائزہ لے لے کہ وہ اخلاص اور خیر خواہی کے جذبے سے تنقید کر رہا ہے یا اس کا محرک کوئی نفسانی جذبہ ہے ۔ اگر پہلی صورت ہو تو بیشک تنقید کی جائے، ورنہ زبان بند کر کے خود اپنے نفس کو اس ناپاکی سے بچانے کی فکر کرنی چاہیے ۔

(۳)، تنقید کا لہجہ اور زبان، دونوں ایسے ہونے چاہئیں جن سے ہر سننے والے کو محسوس ہو کہ آپ فی الواقع اصلاح چاہتے ہیں ۔

(۴)، تنقید کے لئے زبان کھولنے سے پہلے یہ اطمینان کر لیجیے کہ آپ کے اعتراض کی کوئی بنیاد واقعہ میں موجود ہے ۔ بلا تحقیق کسی کے خلاف کچھ کہنا ایک گناہ ہے جس سے فساد رونما ہوتا ہے ۔

(۵) جس شخص پر تنقید کی جائے اسے تحمل کے ساتھ بات سننی چاہیے، انصاف کے ساتھ اس پر غور کرنا چاہیے، جو بات حق ہو اسے سیدھی طرح مان لینا چاہیے، اور جو بات غلط ہو اس کی بدلائل تردید کر دینی چاہیے ۔ تنقید سن کر طیش میں آجانا کبر اور غرور نفس کی علامت ہے ۔

(۶) تنقید اور جواب تنقید اور جواب الجواب کا سلسلہ بلا نہایت نہیں چلنا چاہیے کہ وہ ایک مستقل ردوکد بن کر رہ جائے ۔ بات صرف اُس وقت تک ہونی چاہیے جب تک دونوں طرف کے مختلف پہلو وضاحت کے ساتھ سامنے نہ آجائیں ۔ اس کے بعد اگر معاملہ صاف نہ ہو تو گفتگو ملتوی کر دیجیے، تاکہ فریقین ٹھنڈے دل سے اپنی اپنی جگہ غور کر سکیں ۔ پھر اگر فی الواقع اسے صاف کرنا ضروری ہی ہو تو دوسرے اجتماع میں اس کو پھر چھیڑا جا سکتا ہے ۔ مگر بہرحال آپ کے جماعتی نظم میں کوئی نہ کوئی جگہ ایسی ہونی چاہیے جہاں اختلافی معاملات کا آخری فیصلہ ہو اور جہاں سے فیصلہ ہو جانے کے بعد نزاع ختم ہو جائے ۔

اِن حدود کو ملحوظ رکھ کر جو تنقید کی جائے وہ نہ صرف یہ کہ مفید ہے، بلکہ جماعتی زندگی کو درست رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہے ۔ اس کے بغیر کوئی جماعت زیادہ دیر تک صحیح راستے پر گامزن نہیں رہ سکتی ۔

اس تنقید سے کسی کو بھی بالاتر نہ ہونا چاہیے، خواہ وہ آپ کا امیر ہو، یا مجلس شوریٰ ہو، یا پوری جماعت ہو۔ میں اس کو جماعت کی صحت برقرار رکھنے کے لیے ناگزیر سمجھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ جس روز خدانخواستہ ہماری جماعت میں اس کا دروازہ بند ہوا، اسی روز ہمارے بگاڑ کا دروازہ کھل جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ابتدا سے ہر اجتماع عام کے بعد ارکانِ جماعت کا ایک اجتماعِ خاص اس غرض کے لیے منعقد کرتا رہا ہوں کہ اس میں جماعت کے کام اور نظام کا پورا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ ایسے اجتماعات میں سب سے پہلے میں خود اپنے آپ کو تنقید کے لیے پیش کرتا ہوں، تاکہ جس کو مجھ پر یا میرے کام پر کوئی اعتراض ہو وہ اسے سب کے سامنے بے تکلف پیش کرے اور اس کی تنقید سے یا تو میری اصلاح ہو جائے، یا میرے جواب سے اس کی اور اس کی طرح سوچنے والے دوسرے لوگوں کی غلط فہمی رفع ہو جائے۔ چنانچہ اس طرح کا ایک اجتماع کل رات ہی کو منعقد ہو چکا ہے جس میں کھلی اور آزادانہ تنقید کا منظر سب رفقا دیکھ چکے ہیں ——— مجھے یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ یہ منظر ہمارے بعض نئے رفقا کے لئے، جنہیں ایسے مناظر دیکھنے کا پہلی ہی مرتبہ اتفاق ہوا تھا، سخت صدمے کا موجب ہوا۔ نہ معلوم انھوں نے کس نگاہ سے اس کو دیکھا کہ انہیں صدمہ ہوا۔ بصیرت کی نگاہ سے دیکھتے تو ان کے دل میں جماعت کی وقعت پہلے سے زیادہ بڑھ جاتی۔ آخر اس سرزمین پر جماعت اسلامی کے سوا اور کون سی جماعت ایسی ہے جس میں تین چار سو آدمیوں کے مجمع میں کئی گھنٹے تک ایسی کھلی اور آزادانہ تنقیدیں ہوں اور پھر نہ کرسیاں اچھلیں، نہ سر پھوٹیں، بلکہ اجتماع کے خاتمے پر کسی کے دل میں کسی کی طرف سے غبار تک نہ ہو؟

**سمع و طاعت اور نظمِ جماعت کی پابندی** | ایک چیز جس کا احساس آپ کو دلانے کی ضرورت مجھے محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ابھی آپ کے اندر سمع و طاعت اور نظم کی بہت کمی ہے۔ اگرچہ اپنے ماحول کو دیکھتے ہوئے ہمیں اپنے اندر بڑا ڈسپلن نظر آتا ہے۔ لیکن ایک طرف جب ہم اسلام کے معیارِ مطلوب کو دیکھتے ہیں اور دوسری طرف اُس کٹھن کام کو دیکھتے ہیں جو ہمیں کرنا ہے، تو سچی بات یہ ہے کہ ہمارا یہ موجودہ ڈسپلن بہت ہی حقیر محسوس ہوتا ہے۔

آپ چند مٹھی بھر آدمی ہیں جو تھوڑے سے وسائل لے کر میدان میں آئے ہیں۔ اور کام آپ کے سامنے

یہ ہے کہ فسق اور جاہلیت کی ہزاروں گنی زیادہ طاقت، اور لاکھوں گنے زیادہ وسائل کے مقابلے میں نہ صرف ظاہری نظامِ زندگی کو، بلکہ اس کی باطنی روح تک کو بدل ڈالیں۔ آپ خواہ تعداد کے لحاظ سے دیکھ لیں یا وسائل کے لحاظ سے، آپ کے اور ان کے درمیان کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ اب آخر اخلاق اور نظم کی طاقت کے سوا اور کون سی طاقت آپ کے پاس ایسی ہو سکتی ہے جس سے آپ ان کے مقابلے میں اپنی جیت کی امید کر سکیں؟ آپ کی امانت و دیانت کا سکہ اپنے ماحول پر بیٹھا ہوا ہو، اور آپ کا نظم اتنا زبردست ہو کہ جماعت کے ذمہ دار لوگ جس وقت جس نقطے پر جتنی طاقت جمع کرنا چاہیں ایک اشارے پر جمع کر سکیں، تب ہی آپ اپنے مقصد عظیم میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے اقامت دین کی سعی کرنے والی ایک جماعت میں جماعت کے اولی الامر کی اطاعت فی المعروف دراصل اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا ایک جزء ہے۔ جو شخص اللہ کا کام سمجھ کر یہ کام کر رہا ہے، اور اللہ ہی کے کام کی خاطر جس نے کسی کو اپنا امیر مانا ہے، وہ اس کے جائز احکام کی اطاعت کر کے دراصل اس کی نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے۔ جس قدر اللہ سے اور اس کے دین سے آدمی کا تعلق زیادہ ہوگا، اتنا ہی وہ سمع و طاعت میں بڑھا ہوا ہوگا، اور جتنی اس تعلق میں کمی ہوگی اتنی ہی سمع و طاعت میں بھی کمی ہوگی۔ اس سے بڑی قابلِ قدر قربانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جس شخص کا آپ پر کوئی زور نہیں ہے، اور جسے محض خدا کے کام کے لئے آپ نے امیر مانا ہے، اس کا حکم آپ ایک وفادار ماتحت کی طرح مانیں اور اپنی خواہش اور پسند اور مفاد کے خلاف اس کے ناگوار احکام تک کی بسر و چشم تعمیل کرتے چلے جائیں۔ یہ قربانی چونکہ اللہ کے لئے ہے اس لئے اس کا اجر بھی اللہ کے ہاں بہت بڑا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اس کام میں شریک ہونے کے بعد بھی کسی حال میں چھوٹا بننے پر راضی نہ ہو، اور اطاعت کو اپنے مرتبے سے گری ہوئی چیز سمجھے، یا حکم کی چوٹ اپنے نفس کی گہرائیوں میں محسوس کر کے اور تلخی کے ساتھ اس پر تلملائے، یا اپنی خواہش اور مفاد کے خلاف احکام کو ماننے میں ہچکچائے، وہ دراصل اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ ابھی اس کے نفس نے اللہ کے آگے پوری طرح سر اطاعت خم نہیں کیا ہے اور ابھی اس کی انانیت اپنے دعووں سے دست بردار نہیں ہوئی ہے۔

**امرائے جماعت کو نصیحت** ارکانِ جماعت کو اطاعتِ حکم کی نصیحت کرنے کے ساتھ میں امرائے جماعت کو بھی یہ نصیحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ حکم چلانے کا صحیح طریقہ سیکھیں۔ جس شخص کو بھی نظمِ جماعت کے اندر کسی ذمہ داری کا منصب سونپا جائے اور کچھ لوگ اُس کے تحتِ امر دیے جائیں، اس کے لئے یہ ہرگز حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو کوئی بڑی چیز سمجھنے لگے اور اپنے تابع رفقاء پر بیجا تحکم جتانے لگے۔ اسے حکم چلانے میں کبریائی کی لذت نہ لینی چاہیے۔ اسے اپنے رفقاء سے نرمی اور ملاطفت کے ساتھ کام لینا چاہیے۔ اسے اس بات سے ڈرنا چاہیئے کہ کہیں کسی کارکن میں عدمِ اطاعت اور خودسری کا جذبہ ابھار دینے کی ذمہ داری خود اُس کے اپنے کسی غلط طریقِ کار پر عائد نہ ہو جائے۔ اسے جوان اور بوڑھے، کمزور اور طاقت ور، خوش حال اور خستہ حال، سب کو ایک ہی لکڑی نہ ہانکنا چاہیے، بلکہ جماعت کے مختلف افراد کی مخصوص انفرادی حالتوں پر نگاہ رکھنی چاہیے اور جو جس لحاظ سے بھی بجاطور پر رعایت کا مستحق ہو اس کو ویسی ہی رعایت دینی چاہیے۔ اسے جماعت کو ایسے طریقے پر تربیت دینی چاہیے کہ امیر جو کچھ مشورے اور اپیل کے انداز میں کہے، رفقاء اس کو حکم کے انداز میں لیں اور اس کی تعمیل کریں۔ یہ دراصل جماعتی شعور کی کمی کا نتیجہ ہے کہ امیر کی "اپیل" اثر انداز نہ ہو اور وہ مجبور ہو کر "حکم" دینے کی ضرورت محسوس کرے۔ "حکم" تو تنخواہ دار فوج کے سپاہیوں کو دیا جاتا ہے۔ وہ رضاکار سپاہی جو اپنے دل کے جذبے سے اپنے خدا کی خاطر اکٹھے ہوئے ہوں، خدا کے کام میں خود اپنے بنائے ہوئے امیر کی اطاعت کے لئے حکم کے محتاج نہیں ہوا کرتے۔ ان کو تو صرف یہ اشارہ مل جانا کافی ہے کہ فلاں جگہ تم کو اپنے رب کی فلاں خدمت بجالانے کا موقع مل رہا ہے۔ یہ کیفیت جس روز امرائے جماعت اور رفقائے جماعت میں پیدا ہو جائے گی، آپ دیکھیں گے کہ آپس کی وہ بہت سی بدمزگیاں آپ سے آپ ختم ہو جائیں گی جو اب وقتاً فوقتاً امیروں اور ماموروں کے درمیان پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

**آخری نصیحت** میری آخری نصیحت یہ ہے کہ وہ سب لوگ جو جماعت اسلامی کے ساتھ ہیں، خواہ ارکان ہوں یا متفق، انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ اپنے اندر ابھاریں، خدا کے کام کو اپنے ذاتی کاموں پر ترجیح دیں، اور اس کام میں دل کی وہ لگن پیدا کریں جو انہیں چین سے نہ بیٹھنے دے۔

آپ خود ہی مسلمان نہ بنیں بلکہ اپنی جیب کو بھی مسلمان بنائیں۔ یہ بات نہ بھولیے کہ خدا کے حقوق آپ کے جسم و جان اور وقت ہی پر نہیں ہیں، آپ کے مال پر بھی ہیں۔ اس حق کے لیے خدا اور رسول نے کم سے کم کی حد تو مقرر کر دی ہے، مگر زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں کی ہے۔ یہ حد تجویز کرنا آپ کا اپنا کام ہے۔ اپنے ضمیر سے پوچھیے کہ کتنا کچھ خدا کی راہ میں صرف کر کے آپ یہ خیال کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جو کچھ آپ کے مال پر خدا کا حق تھا وہ آپ نے ادا کر دیا ہے۔ اس باب میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا جج نہیں بن سکتا۔ بہترین جج ہر شخص کا اپنا ضمیر و ایمان ہی ہے۔ البتہ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اُن لوگوں کے طرزِ عمل سے سبق حاصل کیجیے جو نہ خدا کے قائل ہیں، نہ آخرت کے، اور پھر بھی وہ اپنے باطل نظریات کو فروغ دینے کے لیے ایسی ایسی قربانیاں کرتے ہیں جنہیں دیکھ کر ہم خدا اور آخرت کے ماننے والوں کو شرم آنی چاہیے۔

اقامتِ دین کے کام میں رفقاء کو جیسا انہماک ہونا چاہیے اس میں بھی ابھی مجھے بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔ بعض رفیق تو بلاشبہ پوری سرگرمی سے کام کر رہے ہیں جسے دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے اور دل سے ان کے حق میں دعا نکلتی ہے۔ مگر بیشتر حضرات میں ابھی تک دل کی لگن نظر نہیں آتی۔ فسق و فجور کی گرم بازاری اور خدا کے دین کی بے بسی دیکھ کر ایک مومن کے قلب میں جو آگ لگنی چاہیے اس کی تپش کم ہی لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ آپ کو اس پر کم سے کم اتنی بے چینی تو لاحق ہو جتنی اپنے بچے کو بیمار دیکھ کر، یا اپنے گھر میں آگ لگنے کا خطرہ محسوس کر کے لاحق ہوا کرتی ہے۔ یہ معاملہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے لیے سرگرمی اور انہماک کی حد تجویز کر سکتا ہو۔ اس کا فیصلہ تو ہر شخص کو اپنے ضمیر کا جائزہ لے کر خود ہی کرنا چاہیے کہ کتنا کچھ کام کر کے وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب ہو سکتا ہے کہ حق پرستی کے تقاضے اس نے پورے کر دیے ہیں۔ البتہ آپ کی عبرت کے لیے اُن باطل پرستوں کی سرگرمیوں پر ایک نگاہ ڈال لینا کافی ہے جو دنیا میں کسی نہ کسی دینِ باطل کو فروغ دینے کے درپے ہیں اور اس کے لیے سر دھڑ کی بازیاں لگا رہے ہیں۔

مخالفتیں | اب میں مختصر طور پر کچھ اُن مخالفتوں کے باب میں بھی کہوں گا جو حال میں جماعت کے خلاف

بڑے پیمانے پر شروع ہوئی ہیں۔ جہاں تک مدلل اور معقول اختلاف کا تعلق ہے، جس کا مقصد سمجھنا اور سمجھانا ہو، اور جس کے پیچھے نیک نیتی کے ساتھ حق پسندی کام کر رہی ہو، ایسے اختلاف کو تو نہ ہم نے کبھی بُرا سمجھا ہے، نہ انشاء اللہ کبھی بُرا سمجھیں گے۔ جب ہم نے خود بارہا اس نوعیت کا اختلاف دوسروں سے کیا ہے تو آخر ہم دوسروں کے حق اختلاف کا انکار کیسے کر سکتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے مخالفین میں سے بہت کم لوگوں نے اختلاف کا یہ طرزِ اختیار کیا ہے۔ ان کی عظیم اکثریت جس طریقے سے ہماری مخالفت کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہم پر جھوٹے الزام لگاتے ہیں۔ ہماری طرف غلط باتیں منسوب کرتے ہیں۔ ہماری تحریروں کو توڑ مروڑ کر ان کو اپنے من مانے معنی پہناتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ وہ ہماری یا خلق کی اصلاح کے لئے نہیں بلکہ اس لئے کرتے ہیں کہ ہمارے خلاف عوام الناس کو بدگمان کریں اور ایک اسلامی نظام برپا کرنے کی جو کوشش ہم کر رہے ہیں اسے کسی طرح نہ چلنے دیں۔

جھوٹ کا یہ طوفان اٹھانے میں مختلف گروہ شریک ہیں۔ ایک طرف برسرِ اقتدار پارٹی کے لیڈر اور اخبار نویس ہیں جنہیں پاکستان میں اسلامی حکومت کے قیام کی تحریک ناگوار ہے۔ دوسری طرف مغربی فسق و الحاد اور اباحیت کے علمبردار ہیں جنہیں اپنی فکری و عملی آزادیوں پر اسلامی عقائد و اخلاق کی پابندیاں ناگوار ہیں۔ تیسری طرف مختلف گمراہ فرقے ہیں جنہیں سخت اندیشہ ہے کہ اگر یہاں فی الواقع ایک اسلامی حکومت قائم ہوگئی تو ان کے لئے اپنی ضلالتیں پھیلانے کا موقع باقی نہ رہے گا۔ چوتھی طرف اشتراکی حضرات ہیں جو خوب جانتے ہیں کہ ان کے راستے میں اگر کوئی سب سے بڑی رکاوٹ ہے تو جماعتِ اسلامی ہے۔ ان سب کی مخالفت تو ایک حد تک فطری چیز تھی۔ نہ ہوتی تو مقامِ تعجب تھا۔ اور سچائی کو جھوٹ سے دبانے کی کوشش کرنا ان کے لئے کوئی معیوب بات بھی نہیں تھی۔ ان سے تو یہ اخلاق عین متوقع تھے۔ مگر جس چیز کا ہماری پوری جماعت کو صدمہ ہے وہ یہ ہے کہ ان مخالفین میں کچھ علمائے دیوبند اور اہل حدیث بھی نظر آ رہے ہیں، اور غضب یہ ہے کہ جھوٹ اور فتنہ پردازی کے ہتھیار استعمال کرنے میں ان حضرات نے اپنے گمراہ رفیقوں کو بھی مات کر دیا ہے۔ یہ آخری چوٹ فی الواقع ہمارے لئے سخت اذیت بخش ہے، نہ اس لئے کہ ہمیں کچھ ان حضرات کی طاقت سے اندیشہ ہے، بلکہ صرف اس لئے کہ ہم ان حضرات کو

دیندار اور خدا ترس سمجھتے تھے اور انہیں اس روپ میں دیکھنے کی ہرگز توقع نہ رکھتے تھے۔ ہماری تو یہ تمنا تھی کہ یہ اسلامی انقلاب لانے کی کوشش میں آگے آگے ہوتے اور ہم ان کی رکاب تھام کر چلتے۔ مگر افسوس کہ انھوں نے اُن صفوں کو پسند کیا جن میں کمیونسٹ اور منکرین حدیث، اور قادیانی، اور مغربی فسق وفجور کے علمبرداران کے شانہ بشانہ ہم پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ کاش یہ کچھ دیر کے لئے ٹھیر کر سوچ لیتے کہ از کہ گسستی وبا کہ پیوستی!

بہرحال، اب جب کہ اِن مختلف اطراف سے ہماری مخالفت اس رنگ میں ہو رہی ہے، میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے رفقاء کو اس باب میں بھی کچھ ہدایات دے دوں۔

اس سلسلہ میں میری اولین ہدایت یہ ہے کہ آپ کسی حال میں مشتعل نہ ہوں۔ اپنی زبان اور مزاج پر قابو رکھیں۔ اور جب کبھی اشتعال کی کیفیت ابھرتی محسوس ہو اُسے نزغ شیطانی سمجھ کر اللہ کی پناہ مانگیں حقیقت یہ ہے کہ اس کام کو خراب کرنے کے لئے شیطان ہی یہ چال چل رہا ہے۔ وہ ایک طرف ہمارے مخالفین کو جا جا کر اُکساتا ہے اور ان سے بے جا حملے کرواتا ہے۔ اور دوسری طرف ہمیں اُکسانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ ہم جواب اور جواب الجواب میں اُلجھ کر رہ جائیں اور کسی طرح یہ کام نہ کرنے پائیں جو اسے سخت ناگوار ہے۔ ہمیں اس کی اس چال میں نہ آنا چاہیے۔

دوسری ہدایت یہ ہے کہ بعض علماء سے اور ان کے شاگردوں اور معتقدوں سے خواہ آپ کو کتنا ہی رنج پہنچے، آپ اسے بس رنج و افسوس تک محدود رکھیں، اور نفرت تک ہرگز نہ پہنچنے دیں۔ نیز وہ غلطی نہ کریں جو اس سے پہلے لوگ کرتے رہے ہیں کہ انھوں نے بعض علماء کی زیادتیوں پر بگڑ کر تمام علماء کو مطعون کرنا شروع کر دیا، اور پھر اس حد پر بھی نہ رُکے اور خود علمِ دین ہی کو ہدفِ طعن بنا ڈالا۔ آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ علماء کی اکثریت خدا کے فضل سے حق پسند اور حق پرست ہے اور ان میں سے بہترین رفیق آپ کو ملے ہیں اور ملتے چلے جا رہے ہیں۔

تیسری ہدایت یہ ہے کہ آپ مدافعت کا کام مجھ پر چھوڑ دیں اور خود اپنے کام میں لگے رہیں۔ میں جس حد تک ضرورت سمجھوں گا مدافعت کا کام خود کروں گا یا جماعت کے ذمہ دار لوگوں سے لوں گا۔

آپ کا کام بس یہ ہے کہ جب کوئی جھوٹا الزام آپ کے سامنے لایا جائے تو آپ جماعت کے لٹریچر میں سے اس کا جواب نکال کر پیش کر دیں۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی بحث میں اُلجھے تو اس کو سلام کیجئے اور الگ ہو جائیے۔ جسے راستہ چلنا ہو اس کے لئے بہترین حکمت یہ ہے کہ اگر راستے میں کسی کانٹے سے اس کا دامن اُلجھ جائے تو ایک لمحہ ٹھیر کر دامن چھڑانے کی کوشش کرے، اور جب وہ چھوٹتا نظر نہ آئے تو راستہ کھوٹا کرنے کے بجائے دامن کا وہ حصہ پھاڑ کر کانٹے کے حوالہ کرے اور آگے روانہ ہو جائے۔

چوتھی ہدایت یہ ہے کہ سخت سے سخت بیہودہ مخالفت کے جواب میں بھی آپ حدود اللہ سے کبھی تجاوز نہ کریں۔ ہر لفظ جو آپ کی زبان یا قلم سے نکلے اس پر خوب سوچ لیں کہ وہ خلافِ حق تو نہیں ہے، اور آپ اس کا حساب خدا کے ہاں دے سکیں گے؟ آپ کے مخالفین خدا سے ڈریں چاہے نہ ڈریں۔ آپ کو بہر حال اس سے ڈرتے رہنا چاہیے۔

پانچویں ہدایت یہ ہے کہ اس مخالفت نے آپ کی تحریک کے لئے بڑھنے اور ابھرنے کا جو ایک غیر معمولی موقع فراہم کر دیا ہے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیے۔ یہ اللہ نے آپ کے رفعِ ذکر کا سامان کیا ہے۔ اس سے گھبرائیے نہیں بلکہ اس سے کام لیجئے۔ عرب میں اسی نوعیت کے پروپگنڈے کا طوفان جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اٹھا تھا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو خوشخبری دی تھی کہ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔ ہمیں تو شکر گزار ہونا چاہیے کہ ایک طرف حکومت سرکلر پر سرکلر بھیج بھیج کر سرکاری ملازمین سے ہمارا تعارف، اور بڑا وزنی تعارف کرا رہی ہے۔ دوسری طرف تمام گمراہ گروہ اپنے اپنے حلقوں میں ہم کو روشناس کرانے میں لگے ہوئے ہیں۔ اور تیسری طرف علماء کرام اپنے فتووں کے ذریعہ سے مذہبی ذہنیت رکھنے والی آبادی کے گوشے گوشے میں ہمارا چرچا کر رہے ہیں۔ اتنے بڑے پیمانے پر اپنا اشتہار تو ہم بیس سال میں بھی اپنے ذرائع سے نہ کر سکتے تھے۔ اب ہمارا کام صرف اتنا رہ گیا ہے کہ جہاں جہاں ہمارا برا تعارف کرایا گیا ہے وہاں ہم اپنا اچھا تعارف کرا دیں۔ اس کا انشاء اللہ دوہرا فائدہ ہوگا۔ جس جس پر اس جھوٹے پروپگنڈے کی حقیقت کھل جائے گی وہ صرف جماعتِ اسلامی کا گرویدہ ہی نہ ہو جائے گا بلکہ ساتھ ساتھ اس کے دل سے اُن لوگوں کی وقعت بھی نکل جائے گی جن کے جھوٹ اور

جن کی حق دشمنی کا صریح ثبوت وہ آنکھوں دیکھ لے گا۔ شیطان کے کید کو اِسی لئے اللہ نے ضعیف فرمایا ہے کہ وہ اپنے اولیاء کو ایسے ہتھیار فراہم کرکے دیتا ہے جو عارضی طور پر تو بڑے کارگر ثابت ہوتے ہیں، مگر بالآخر خود اُسی شخص کی شہ رگ کاٹ دیتے ہیں جو انہیں استعمال کرتا ہے۔

آخری ہدایت خاص طور پر جماعت کے ان لوگوں کے لئے ہے جو علماء کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ ان میں سے ہر گروہ کے لوگ اپنے اپنے گروہ کے علماء کو سمجھائیں۔ وہ فرداً فرداً اور مجتمعاً ان سے ملیں بھی اور ان کو خطوط بھی لکھیں۔ وہ ان سے کہیں کہ اے حضرات! آپ یہ جو کچھ کر رہے ہیں اِس کے عواقب پر بھی آپ نے غور کر لیا ہے؟ اس سے پہلے مختلف مرحلوں پر آپ کے اور نئی تعلیم یافتہ نسلوں کے درمیان جو آویزشیں ہو چکی ہیں ان کی بدولت آپ کا وقار پیہم گرتا چلا گیا ہے، اور اس سے آپ ہی کے وقار کو نہیں، خود دین کے وقار کو بھی بہت بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ اب جماعت اسلامی نے ان میں سے بہترین عناصر کو چن چن کر دین کی طرف لانا شروع کیا تھا اور دینی رغبت کی وجہ سے یہ لوگ آپ سے قریب تر ہونے لگے تھے تو آپ نے اس کے خلاف یہ لڑائی چھیڑ دی۔ اور چھیڑی بھی تو ایسے بھونڈے طریقے سے کہ نئے تعلیم یافتہ لوگ تو درکنار، آپ کے اپنے شاگردوں تک کے دلوں میں آپ کی عقیدت باقی رہنی مشکل ہو گئی۔ ان حرکتوں سے آخر آپ کس فائدے کے متوقع ہیں؟ آپ خود جانتے ہیں کہ پاکستان میں ایک اسلامی نظامِ حکومت قائم کر دینا اور اُسے چلا لے جانا بہر حال آپ کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ کام اگر کر سکتے ہیں تو آپ نہیں بلکہ نئے تعلیم یافتہ لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ اور نئے تعلیم یافتہ لوگوں میں وہ طبقہ جو اسلام کے منشا کے مطابق اپنے ذہن اور اخلاق اور سیرت کو ڈھال رہا ہے وہ وہی ہے جو جماعت اسلامی کی طرف کھیچ رہا ہے۔ اس کے سوا آپ اِس گروہ میں کسی دوسرے فعال اور طاقت ور دینی رجحان رکھنے والے طبقے کی نشان دہی نہیں کر سکتے، اور آپ خود اس لائق بھی نہیں ہیں کہ ان لوگوں میں اپنی کوششوں سے کوئی ایسا طبقہ پیدا کر سکیں۔ اب اگر آپ اِس جماعت کی مزاحمت کرتے ہیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آپ پاکستان میں ہر فاسق، فاجر، اور گمراہ گروہ کی قیادت کو برداشت کر سکتے ہیں، مگر نہیں برداشت کر سکتے تو کسی دیندار گروہ کی قیادت کو۔ کیا فی الواقع آپ نے یہی پوزیشن اختیار

کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟ اور خدا کے ہاں اس کی جواب دہی جو کرنی ہوگی اس کا انجام بھی سوچ لیا ہے؟ اگر بالفرض آپ کو جماعت سے بعض مسائل میں اختلاف تھا تو کیا اس اختلاف کو چھیڑنے کا موزوں ترین وقت یہی تھا؟ اور کیا اس اختلاف کو گفت و شنید یا علمی بحث و تنقید سے رفع کرنے کی کوشش نہ کی جا سکتی تھی؟ کیا وہ مسائل ایسے ہی اہم تھے کہ ان پر جماعت کے خلاف فتوے لگانے اور اشتہار چھاپنے اور پمفلٹ نکالنے کے سوا چارہ نہ تھا؟ پھر اگر یہ سب کچھ ضروری تھا اور آپ محض حمایتِ دین ہی کے جذبے سے یہ کارِ خیر کرنے اٹھے تھے، تو کیا واقعی کوئی شخص حمایتِ دین کی خاطر، للہ و فی اللہ، دوسرے کی عبارتیں مسخ بھی کیا کرتا ہے؟ اور جو کچھ اس نے نہیں کہا وہ اپنی طرف سے گھڑ کر اس کی طرف منسوب بھی کر دیتا ہے؟ اور اس کی اپنی تحریروں سے الزامات کی غلطی ثابت ہو جانے کے بعد بھی اپنے الزام پر اصرار کیا کرتا ہے؟ —— یہ باتیں ہیں جو ہماری جماعت کے دیوبندی اور مظاہری اور اہل حدیث رفقاء کو اپنے اپنے گروہ کے بزرگوں سے صاف صاف کہنی چاہییں۔ خصوصاً میں اپنے دیوبندی اور مظاہری بھائیوں سے کہوں گا کہ دیوبند و مظاہر العلوم کے بزرگوں نے اس بھروسے پر جماعت کے خلاف یہ مہم شروع کی ہے کہ ہمارے دار العلوموں سے نکلے ہوئے لوگ ہندوستان و پاکستان میں ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں، جب ہم اپنے دستخطوں سے فتوے اور اشتہار شائع کریں گے تو تمام مظاہری و دیوبندی آنکھیں بند کر کے خالص استاد پرستی اور گروہی عصبیت کی بنا پر ہر طرف سے ہماری آواز میں آواز ملانی شروع کر دیں گے۔ اب یہ آپ لوگوں کا کام ہے کہ ان کی یہ غلط فہمی دور کریں اور انہیں بتا دیں کہ دیوبند و مظاہر العلوم سے ہم نے قرآن و حدیث کا فیض تو ضرور حاصل کیا ہے، مگر ایمان نگلنا نہیں سیکھا!

آخر اس تعلیمِ قرآن و حدیث کا حاصل کیا جس سے آدمی حق پرستی کے بجائے استاد پرستی اور پیر پرستی سیکھے، اور اسلامی حمیت کے بجائے گروہی عصبیت کا سبق لے!

**دعوت کا مختصر کورس**

اس کے بعد میں توسیعِ دعوت کے سلسلے میں آپ لوگوں کو کچھ مشورے دوں گا۔ اب ہماری دعوت کا ایک جامع اور مختصر کورس نکل آیا ہے جس سے آپ کام لے سکتے ہیں۔ اب تک تو جماعت کے کارکنوں کو یہ پریشانی پیش آتی تھی کہ ہمارا لٹریچر بہت پھیلا ہوا ہے اور سب لوگوں

کو سارا لٹریچر پڑھوا دینا مشکل ہے۔ ان کے لئے یہ فیصلہ کرنا بھی دشوار تھا کہ لٹریچر میں سے کیا کچھ پڑھ لینے کے بعد ایک آدمی اس قابل ہو سکتا ہے کہ اسے جماعت میں لیا جا سکے۔ مگر اب یہ دشواری ہماری چند مطبوعات کے نکلنے سے رفع ہو گئی ہے۔ آپ جن لوگوں سے بھی جماعت کا تعارف کرائیں ان کو پہلے یہ چیزیں پڑھنے کے لئے دیں:

۱۔ جماعت اسلامی، اس کی دعوت، تاریخ اور لائحہ عمل

۲۔ دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات

۳۔ جماعت اسلامی کی دعوت

۴۔ میری یہ دونوں تقریریں جو میں نے ابھی کراچی کے اس اجتماع کا افتتاح اور اختتام کرتے ہوئے کی ہیں اور جو عنقریب تحریری صورت میں مرتب کر کے شائع کر دی جائیں گی۔[1]

جب کوئی شخص یہ چیزیں پڑھ لے تو اس کے سامنے جماعت کا دستور پیش کر دیں۔ اور یہ اس کی مرضی پر چھوڑ دیں کہ چاہے تو رکنیت کی درخواست کرے، یا متفقین میں شامل ہو جائے۔ مگر جماعت کے ساتھ وابستہ ہو جانے کے بعد اُسے پورا لٹریچر پڑھنے کا مشورہ ضرور دیجیے۔ اس کے بغیر اس کی ذہنیت اور سیرت اچھی طرح تیار نہ ہو سکے گی، اور زندگی کے مختلف مسائل و معاملات میں اسلامی نقطہ نظر کو وہ ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے قابل نہ ہو سکے گا۔ البتہ پورے لٹریچر کا مطالعہ جماعت میں داخل ہونے سے پہلے کر لینا ضروری نہیں ہے۔

**خواتین کے لیے ہدایات**

اب تک جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا بیشتر حصہ مردوں اور عورتوں کے لیے مشترک تھا۔ اب میں خاص طور پر کچھ باتیں اُن خواتین سے عرض کروں گا جو جماعت کے ساتھ وابستہ ہیں یا اس سے دلچسپی رکھتی ہیں۔

---

[1] یہ دونوں تقریریں شائع ہو چکی ہیں اور ان کے نام یہ ہیں: "ہمارے داخلی اور خارجی مسائل"۔ اور "مسلمانوں کا ماضی و حال، اور مستقبل کا لائحہ عمل"۔

اولین ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ اپنے دین سے زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کریں۔ نہ صرف قرآن سمجھ کر پڑھیں بلکہ کچھ نہ کچھ حدیث اور فقہ کا مطالعہ بھی کریں۔ نہ صرف دین کی بنیادی باتوں اور ایمان کے تقاضوں کو جانیں بلکہ یہ بھی معلوم کریں کہ آپ کی ذاتی زندگی، گھر کی زندگی، خاندان کی زندگی اور عام معاشرتی زندگی کے بارے میں دین کے احکام کیا ہیں۔ احکام دینی سے عورتوں کی عام ناواقفیت اُن اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے جن کی بدولت مسلمان گھروں میں غیر شرعی طریقے رائج ہوئے ہیں۔ بلکہ جاہلیت کی رسموں تک نے راہ پالی ہے۔ آپ کو سب سے پہلے خود اپنی اس خامی کو رفع کرنے کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ جماعت کی طرف سے بھی انشاء اللہ اس امر کی پوری کوشش کی جائے گی کہ مستقل زنانہ تربیت گاہیں قائم کی جائیں۔ مگر ابھی اس کا انتظام کرنے میں کچھ مشکلات حائل ہیں۔ سر دست یہ طے کیا گیا ہے کہ جہاں جہاں ممکن ہو، مردانہ تربیت گاہوں کے ساتھ ایسا باپردہ انتظام کیا جائے جس سے خواتین بھی تربیت کے کورس میں شریک ہو جائیں۔ جہاں اس کا موقع ملے، آپ اس سے پورا فائدہ اٹھائیں۔

دوسرا کام یہ ہے کہ آپ کو دین کا جو علم حاصل ہو اس کے مطابق آپ اپنی عملی زندگی کو، اپنے اخلاق اور سیرت کو، اور اپنے گھر کی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کریں۔ ایک مسلمان عورت میں کیرکٹر کی یہ مضبوطی ہونی چاہیے کہ وہ جس چیز کو حق سمجھے اس پر سارے گھر اور سارے خاندان کی مخالفت و مزاحمت کے باوجود ڈٹ جائے، اور جس چیز کو باطل سمجھے اسے کسی کے زور دینے پر بھی قبول نہ کرے۔ ماں، باپ، شوہر، اور خاندان کے دوسرے بزرگ یقیناً اس کے مستحق ہیں کہ ان کی فرمانبرداری کی جائے، ان کا ادب ولحاظ کیا جائے، اُن کے مقابلے میں نشوز اور خود سری نہ اختیار کی جائے۔ مگر سب کے حقوق اللہ اور اس کے رسولؐ کے حقوق سے نیچے ہیں نہ کہ ان کے اُوپر۔ خدا اور رسول کی نافرمانی کے راستے پر جو بھی آپ کو چلانا چاہے، آپ اس کی فرمانبرداری سے صاف انکار کر دیں، خواہ وہ باپ ہو یا شوہر۔ اس معاملے میں آپ ہرگز کسی سے نہ دبیں۔ بلکہ اس کا جو بدتر سے بدتر نتیجہ آپ کی دنیوی زندگی کو برباد کرتا نظر آئے اس کو بھی توکلاً علی اللہ گوارا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ دین کے اتباع میں آپ جتنی مضبوطی دکھائیں گی، انشاء اللہ اتنا ہی آپ کے ماحول پر اچھا اثر پڑے گا اور بگڑے ہوئے گھروں کو درست کرنے کا آپ

کو موقع ملے گا۔ اس کے برعکس بے جا اور غیر شرعی مطالبات کے آگے جس قدر آپ جھکیں گی، آپ کی اپنی زندگی بھی اسلام کی برکات سے محروم رہے گی، اور آپ اپنے گرد و پیش کی سوسائٹی کو بھی ایمان و اخلاق کی کمزوری کا ایک بُرا نمونہ دیں گی۔

تیسرا کام آپ کے ذمہ یہ ہے کہ تبلیغ و اصلاح کے معاملے میں اپنے گھر کے لوگوں، اپنے بھائی بہنوں، اور اپنے قریبی رشتہ والوں کی طرف سب سے پہلے اور سب سے زیادہ توجہ کریں۔ جن بہنوں کو اللہ نے اولاد دی ہے ان کے ہاتھ میں تو گویا اللہ نے امتحان کے وہ پرچے دے دیے ہیں جن پر اگر وہ کامیابی کے نمبر نہ لے سکیں تو پھر دوسرا کوئی پرچہ بھی ان کے اس نقصان کی تلافی نہ کر سکے گا۔ ان کی توجہ کی مستحق سب سے بڑھ کر ان کی اولاد ہے جسے دین اور دینی اخلاق کی تربیت دینا ان کی ذمہ داری ہے۔ شادی شدہ خواتین کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے شوہروں کو راہ راست دکھائیں، اور اگر وہ راہ راست پر ہوں تو اس پر چلنے میں ان کی زیادہ سے زیادہ مدد کریں۔ ایک لڑکی ادب و احترام کے پورے حدود ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے باپ اور اپنی ماں تک بھی کلمۂ حق پہنچا سکتی ہے، اور کم از کم اچھی کتابیں تو ان کے مطالعہ کے لئے پیش کر ہی سکتی ہے۔

چوتھا کام، جسے آپ کو فرض سمجھتے ہوئے انجام دینا چاہیے، یہ ہے کہ جس قدر وقت بھی آپ اپنے خانگی فرائض سے بچا سکتی ہوں وہ دوسری عورتوں تک دین کا علم پہنچانے میں صرف کریں۔ چھوٹی لڑکیوں کو تعلیم دیجئے۔ بڑی عمر کی ان پڑھ عورتوں کو پڑھائیے۔ پڑھی لکھی عورتوں تک اسلامی کتابیں پہنچائیے۔ عورتوں کے باقاعدہ اجتماعات کر کر کے ان کو دین سکھائیے، یا تقریر نہ کر سکتی ہوں تو مفید چیزیں سنائیے۔ غرض آپ جس جس طرح بھی کام کر سکتی ہوں، کریں اور امکانی حد تک پوری کوشش کریں کہ آپ کے حلقۂ تعارف میں عورتوں سے جہالت اور جاہلیت دور ہو۔

تعلیم یافتہ خواتین پر اس وقت ایک اور فرض بھی عائد ہوتا ہے جو ایک لحاظ سے اپنی اہمیت میں دوسرے تمام کاموں سے بڑھ کر ہے۔ وہ یہ کہ اس وقت مغرب زدہ طبقے کی خواتین پاکستان کی عورتوں کو جس گمراہی، بے حیائی، اور ذہنی و اخلاقی آوارگی کی طرف دھکیل رہی ہیں، اور جس طرح حکومت کے ذرائع و وسائل سے کام لیکر عورتوں کو غلط راستے پر ڈالنے کی کوششیں کی جارہی ہیں، ان کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا جائے۔

یہ کام صرف مردوں کے کیے نہیں ہو سکتا۔ مرد جب اس گمراہی کی مخالفت کرتے ہیں تو عورتوں کو یہ کہہ کہہ کر بھڑکایا جاتا ہے کہ یہ مرد تو تم کو غلام رکھنے پر تلے ہوئے ہیں، ان کی تو ہمیشہ سے یہی مرضی رہی ہے کہ عورتیں چار دیواریوں میں گھٹ گھٹ کر مرتی رہیں اور انہیں آزادی کی ہوا نہ لگنے پائے۔ اس لئے ہمیں اس فتنے کا سدِّ باب کرنے میں عورتوں کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔ خدا کے فضل سے ہمارے ملک میں ایسی شریف اور خدا پرست خواتین کی کمی نہیں ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اِن اپوا کی بیگمات سے علم اور ذہانت اور زبان و قلم کی طاقت میں کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اب یہ ان کا کام ہے کہ آگے بڑھ کر اِن کا منہ توڑ جواب دیں۔ وہ انہیں بتائیں کہ مسلمان عورت حدود اللہ سے باہر قدم نکالنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہے۔ وہ ڈنکے کی چوٹ کہیں کہ مسلمان عورت اُس ترقی پر لعنت بھیجتی ہے جسے حاصل کرنے کے لئے خدا اور اس کے رسولؐ کی مقرر کی ہوئی حدیں توڑنی پڑیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کا یہ کام بھی ہے کہ منظم ہو کر ہر اُس حقیقی ضرورت کو جس کی خاطر حدود شکنی کو ناگزیر کہا جاتا ہے، اسلامی حدود کے اندر پورا کر کے دکھائیں، تاکہ ہر گمراہ کرنے والے اور کرنے والی کا ہمیشہ کے لئے منہ بند ہو جائے۔

---

# شپنگلر کے نظریۂ تمدّن پر ایک نظر

(از جناب عبد الحمید صاحب، ایم۔ اے)

نہ معلوم علمی حلقوں میں یہ سوال کتنی بار دہرایا گیا ہے کہ ایک تمدن جو مٹ چکا ہو، کیا اُس کے احیاء کی بھی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟ شپنگلر اور اس کے ساتھی تمدن کو ایک فرد کی زندگی پر قیاس کرتے ہوئے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ایک انسان کی زندگی کی طرح طفولیت، جوانی اور بڑھاپے کے ادوار میں سے گذر کر موت کی آغوش میں جا گرتا ہے۔ ان کے نظریے کا خلاصہ یہ ہے:

تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ایک تمدن جنم لیتا ہے اور کچھ مدت کے بعد عہد طفولیت میں قدم رکھتا ہے۔ اس دور میں اُس کے علم برداروں میں انتہائی جوش و خروش دکھائی دیتا ہے۔ ساری کی ساری کائنات، اور اس کی آغوش میں جتنے واقعات پلتے ہیں، اُن میں اس کے متبعین ایک مقصدی ترتیب اور ارادی ربط دیکھتے ہیں۔ افراد اور اُن کے عمل و نظر کے زاویوں کی قریب قریب ایک ہی صورت ہوتی ہے۔ اس عہد کی حکومت کی بنیادیں نہایت ہی محکم اور مستحکم نظر آتی ہیں، اور خیالات اور دل و دماغ کی وسعت کے ساتھ ساتھ سلطنت کی وسعت کا افق بھی پھیلتا چلا جاتا ہے۔ ان کا آرٹ ابتدائی اور ناتراشیدہ ہونے کے باوجود قوت بخش ہوتا ہے اور سفر کے اسی راستہ پر گامزن ہو کے تمدن دورِ شباب میں داخل ہوتا ہے۔

یہ دوسرا دور علم و ادب کا زرین زمانہ کہلاتا ہے۔ خدا پر ایمان راسخ اور گہرا ہونے کی وجہ سے افراد کے دل و دماغ کے ہر ریشہ میں سرایت کرتا ہے۔ اس ماحول میں سانس لینے والے انسان خدا کو انسانی شکل دینے کے جذبے کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ کائنات اور اس کے مختلف مشاہدات میں اب بھی ایک ربط محسوس کیا جاتا ہے۔ حکومت کے لیے دلوں میں انتہائی پاسداری موجود ہوتی ہے۔

سماج کا اعلیٰ طبقہ پُرشوکت اور شائستہ زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ عہد اپنے آپ کو پانچویں صدی قبل مسیح کے ایتھنز، قیصر آگسٹس کے روما اور اٹھارویں صدی کے فرانس میں جلوہ گر پاتا ہے۔

ترقی کے یہ سارے منازل طے کر چکنے کے بعد پھر انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔ علم و ادب کے سارے چشمے خود بخود سوکھ جاتے ہیں سنہری دور نقرئی دور میں بدل جاتا ہے۔ چالاکی اور عیاری قوم کی تخلیقی قوتوں کی جگہ لے لیتی ہے حکومتیں جو جمہوریت کا مظہر اتم ہوتی ہیں آمریت کے سانچوں میں ڈھل جاتی ہیں اور اپنی قوت کے پودوں کی سونے چاندی کے پانی سے آبیاری کرنے لگتی ہیں۔ خداوند عالم سے جس قدر رشتے ہوتے ہیں بالکل ٹوٹ جاتے ہیں۔ کائنات میں جو ہم آہنگی نظر آتی ہے وہ پردۂ غیب میں منہ چھپا لیتی ہے۔ انسانی زندگی بلند تر مقاصد سے گر کر عیش پسندی کے معیار پر گھومنا شروع کر دیتی ہے اور کسی بیرونی دشمن کے ایک ہی بھرپور حملے سے تمدن کی یہ عمارت پیوندِ خاک ہو جاتی ہے۔

اس مدرسۂ فکر کے خیال میں سب تمدنوں کے ساتھ تقریباً یہی معاملہ ہوا۔ مصر کے مقبروں سے اُسرانی تہذیب پیدا ہوئی، پھر اُسے بھی زوال ہوا۔ یونان کے فکری کھنڈرات سے روم کا عظیم الشان قانون اُبھرا، پھر اس پر بھی موت طاری ہو گئی۔ تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ ہزاروں نہیں، لاکھوں قومیں مختلف تمدنوں کی علمبردار بن کر اس دنیا کے اسٹیج پر اُبھریں۔ تاریخ کے صفحات نے ان کا خیر مقدم کیا، وہ بڑھیں اور ان کے افکار و نظریات پھلے پھولے، انہوں نے طاقت کو غلام بنایا اور دنیا پر چھا گئیں پھر جب موت کی ساعت آئی تو ہمیشہ کے لیے سو گئیں۔ بچاؤ کے سارے حیلے پھر اس تنزل کو باز نہیں رکھ سکے، کیونکہ یہ اُن کی اجل تھی، اور جب اجل آجائے تو ٹل نہیں سکتی۔ تاریخ کے اوراق ہی پھر اُن کے مدفن بھی بنتے۔ اب ان گزری ہوئی اقوام کی جامد روایات باقی ہیں۔ ایک تن جس سے جان نکل چکی ہو اُس کے لیے بقراط و جالینوس کی حکمت بھی چارہ گر نہیں ہو سکتی۔ بالکل اسی طرح ایک تمدن جو مٹ چکا ہے، اس کے لیے احیاء کی جدو جہد بالکل بے سود ہے اور اس سلسلہ کی تمام کوششیں ناکام و نامراد ثابت ہوں گی۔

**تمدن کی ماہیت** | یہ ہے تمدن کے متعلق وہ نظریہ جو شپنگلر نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "زوالِ مغرب"[1] میں

ؔ۱ Decline of the West by Oswald Spengler.

پیش کیا ہے۔ تمدن سے متعلق اُس کے نظریہ کی تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ تمدن سے اس کی مراد اخلاقی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور بین الاقوامی قوانین کی ظاہری اور خارجی نمود ہے جو کسی قوم کی زندگی میں جلوہ گر ہوتی ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمدن کا بڑا ہی سطحی تصور ہے۔ تمدن محض ان سطحی، خارجی اور محسوس شعائر کا مجموعہ نہیں ہے جو ایک قوم کے باشندوں میں دیکھے جاتے ہیں، بلکہ ہر قسم کے تمدن کی اصل جڑ انسانی ذہن میں لگی ہوتی ہے جس سے ظاہری واقعات کی یہ ساری کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ تمدن کی اس جڑ کا نام تہذیب ہے جو دراصل عبارت ہے اس خاص ذہنی میلان یا اندازِ فکر سے جو ایک خاص قسم کی سیرت و کردار پر منتہی ہوتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ وہ کسی قوم کا ایک مخصوص اخلاقی اور عقلی مزاج ہے جس کی بنا پر اس کے بیشتر افراد عام حالات میں ایک مخصوص طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یورپ کی موجودہ اقوام اور یونان و روما کی گزری ہوئی قوموں کے تمام تمدنی اختلافات کے باوجود ہم ان میں ایک ہی تہذیب کارفرما پائیں گے، کیونکہ جن فکری اور اخلاقی عناصر سے ان کی سرشت کا خمیر اٹھایا گیا ہے وہ سب میں یکساں و مشترک ہیں۔ گزری ہوئی قوموں کو تو فی الحال نظر انداز کیجیے۔ موجودہ دور کی انگریزی، امریکی، جرمن، فرانسیسی اقوام پر ایک نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے اساسی مسائل ایک جیسے ہیں۔ اور ان کے حل کرنے کے طریق اگر ظاہر میں نہیں تو کم از کم اپنی اخلاقی و ذہنی روح کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت حد تک ملتے جلتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان سب ممالک میں ایک فرد کے ساتھ دوسرے فرد کے تعلقات کو، سرمایہ اور محنت کے روابط کو، سماج اور فرد کے رشتے کو ایک ہی بنیاد پر استوار کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر کیوں ان میں اس قدر مماثلت اور یگانگت دکھائی دیتی ہے؟ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان سب ممالک کے باشندوں کے ذہنوں پر مادہ پرستی سوار ہے اور فکر و عمل کے سارے دھارے اسی مادہ پرستی کے چشمہ سے اُبلتے ہیں۔ اور یہ مادہ پرستانہ ذہنیت صرف معاشی میدان میں ہی نظر نہیں آتی بلکہ اُن کی زندگی کے خالص مذہبی اور اخلاقی خانے بھی اسی کی رنگینیوں سے جگمگا رہے ہیں۔ اُن کی زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جس میں یہ ذہنیت اپنے آپ کو پوری آب و تاب سے منعکس نہ کرے۔ اس سلسلے میں یہ بھی یاد رہے کہ تمدن ایک مربوط نظامِ فکر و عمل ہوتا ہے جس کے مختلف شعبوں

میں مشترک روحِ تہذیب کی وجہ سے پوری ہم رنگی و یگانگت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ جدید تمدن کا تجزیہ کرنے سے ہمیں معلوم ہوگا کہ جس اساس پر اس کی سر بفلک عمارت اٹھائی گئی ہے وہ محسوس پرستی، الحاد اور مادہ پرستی ہے۔ تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ تمدن بنتے اور بگڑتے رہے، مگر ایک ہی روحِ تہذیب بار بار مختلف قوموں کے تمدن میں ظہور کرتی رہی۔ جب چین کی پرانی تہذیب کو زوال آیا تو اسی بنیاد پر یونانی تہذیب نے جنم لیا، اور جب یونانی اور رومی تہذیب بھی اپنے متبعین کی باہمی منافرت اور جنگ و جدل کی وجہ سے مٹنے لگی تو پھر مشرقِ بعید میں ویسی ہی تہذیب اگلے دو تین سو سالوں میں معرضِ وجود میں آگئی[1]۔

**تہذیبوں کی تکرارِ ظہور** آخر وہ کیا اسباب ہیں جن کی بنا پر ایک ہی تہذیب مختلف قوموں کے تمدن میں بار بار جلوہ گر ہوتی ہے؟ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ جو قوم بھی کسی نظریۂ حیات کو اپنا کر اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال لیتی ہے اُس قوم کے افراد میں اسی کے مزاج سے مناسبت رکھنے والے سیرت و کردار نمودار ہوتے ہیں۔ جب ایک قوم کے افراد عادتاً ایک ہی طرح کے عمل کرتے ہیں تو یہ اُس قوم کا تمدن کہلاتا ہے، اور وہ ذہنی ساخت جس کی وجہ سے اس قسم کے عمل ظہور میں آتے ہیں وہ اس کی بنیادی تہذیب ہے۔ تمدن درحقیقت تہذیب کا ایک خاص جغرافیائی ماحول میں محسوس عملی ظہور ہے۔ زمان و مکان کے اختلافات ممکن ہے دو تمدنوں کی ظاہری شکلوں میں، جن کی اساس ایک ہو، بڑا نمایاں فرق پیدا کر دیں لیکن اُن کے حاملین کا اگر تہذیبی نقطۂ نظر ایک ہے تو ان کے تمدن کی مختلف شکلوں میں بھی بہت حد تک بنیادی مماثلت اور یگانگت دکھائی دے گی۔ اگر ہم تمام دنیا کے تمدنوں کو خدا شناسی اور خدا ناشناسی کے اعتبار سے تقسیم کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ایک قسم کے تمدن چاہے مختلف ادوار میں کتنے ہی مختلف ناموں سے پکارے گئے ہوں مگر روح کے لحاظ سے وہ ایک ہی طرح کے رہے۔ انسانی فطرت میں کوئی اساسی فرق واقع نہیں ہوا۔ وہ جوں کی توں ہے۔ خارجی مسکن بدل جانے سے کوئی حقیقت نہیں بدل سکتی۔ مادی کارخانوں میں تخریب و تعمیر کا جو ہنگامہ برپا ہے، بگاڑ اور بناؤ کا جو تلعم دکھایا جا رہا ہے، زوال و کمال کا جو کھیل کھیلا جا رہا ہے، یہ محدود سے محدود اور وسیع سے وسیع میدانوں میں ایک ہی

[1] Civilization on Trial by A. J. Toynbee.

شہادت فراہم کرتا ہے۔ یہ کہ اس ظاہری پردۂ فلم پر انسانی فطرت اور اس کے شعوری خصوصیات اور غیر شعوری جذبات و ہیجانات چھپے چھپے عکاسی کر رہے ہیں، اور انجان یہ جانتا ہے کہ اس پردے پر کوئی تغیر واقع ہو رہا ہے۔ انسانی عمل کے سارے کے سارے محرکات محبت، شہرت، بھوک، کبریائی کی دھن، جذبۂ خدمت، سماج کی پاسداری، ذوقِ خداپرستی ہر عہد میں بر سر عمل رہے ہیں — چاہے ان کے اثر کی پرچھائیوں میں کتنا ہی سمٹاؤ اور کتنا ہی پھیلاؤ کیوں نہ ہو مگر ان محرکات میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ جو نیکی یا بدی اس کرۂ ارضی پر ایک دفعہ عمل میں آ چکی ہے وہ اپنے آپ کو دہراتی چلی آ رہی ہے۔ اور نہ معلوم یہ چکر کب تک جاری رہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نیکی اور بدی بار بار ابھرتی اور دبتی ہے، مگر یہاں ماضی ہی استقبال کا بھیس بدل کر حال کے سٹیج پر رونما ہوتا ہے اور سطح بین آنکھیں یہ گمان کرنے لگتی ہیں کہ یہ کوئی نیا کھیل ہے جو کھیلا جانے لگا ہے جس کا کوئی تعلق بھی گزرے ہوئے زمانوں سے نہیں۔ دراصل یہ زندگی کی حقیقت سے سخت ناانصافی ہے۔ جنگ و جدال اور گروہ بندی جب سے دنیا قائم ہے، موجود ہے اور اسے دنیا سے بالکل مٹایا نہیں جا سکتا۔ مثال کے طور پر امریکہ کی خانہ جنگی نوعیت کے اعتبار سے کوئی بے مثال واقعہ نہیں۔ اس سے ملتے جلتے ہزاروں واقعات تاریخ عالم میں رونما ہو چکے ہیں۔ جن واقعات کا امریکہ کی خانہ جنگی میں ظہور ہوا وہی بسمارک کی جنگوں میں جرمنی کی سرزمین میں ۱۸۶۴ء - ۱۸۷۱ء کے درمیان دہرائے گئے۔ دونوں ملکوں میں نامکمل سیاسی اتحاد ہی خطرے کا باعث بنا، دونوں ممالک میں اس اتحاد کا شیرازہ بکھرنے اور پھر اس اتحاد کے دوبارہ قائم ہونے کا آخری فیصلہ قاضیٔ شمشیر نے کیا، دونوں میں اتحاد کے حامیوں کی جیت ہوئی، اور فتح کی وجہ ان کی فنی اور صنعتی برتری تھی، پھر دونوں ممالک میں فتح کا نتیجہ ملک میں صنعتی ترقی تھا، جس نے دونوں قوموں کو انگلستان کا تجارتی میدان میں رقیب بنا دیا۔

واقعات کی اس تکرار کی مثال انگلستان کا صنعتی انقلاب ہے۔ آغاز کے وقت یہ بالکل اپنی مثال آپ تھا۔ مگر ۱۸۷۰ء کے بعد بہت سی یورپین اور غیر یورپین قومیں انقلاب کے اسی چکر میں سے گزریں۔ جو جو فوائد اور مصائب انگلستان کو پیش آئے تھے وہ انہیں بھی پیش آئے۔ انقلاب کی مضرتیں اور سہولتیں سب کی سب انہیں بھی نصیب ہوئیں۔

آپ اگر صنعتی دائرہ سے نکل کر سیاسی میدان میں بھی دیکھیں گے تو وہاں بھی آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے۔ اضلاع متحدہ امریکہ اور جرمنی کی تہذیب کینیڈا میں دہرائی جا رہی ہے۔ عہد جدید میں ہی دیکھیں گے کتنے وفاقی اتحاد قائم ہوتے ہیں۔ اور پھر ان میں کتنے صنعتی انقلابات آتے ہیں۔ صنعتی انقلاب کا ڈرامہ پہلے انگلستان میں کھیلا گیا، پھر اسی کا اعادہ امریکہ اور جرمنی میں ہوا۔ اسی طرح فیڈرل یونین کا قیام پہلے امریکہ میں ہوا اور اب آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور برازیل میں اس کا ظہور ہوا ہے۔[۱]

ممکن ہے کہ ان سب ممالک میں جہاں ان واقعات کو دہرایا گیا ہے ان کے جغرافیائی حالات کی وجہ سے واقعات میں کسی حد تک کوئی فرق آگیا ہو۔ مگر وہ فرق ظاہری ہوگا، بنیادی نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لیے کہ انسان کی بنیادی فطرت ہر ملک اور ہر عہد میں ایک ہی رہتی ہے۔ انسانی فطرت جن ناقابل تغیر خصوصیات پر مبنی ہے وہ امتداد زمانہ اور تغیر احوال کے باوجود یکساں اور غیر تبدیل ہے۔ لہٰذا انسانی تاریخ میں کوئی چیز نئی نہیں۔ کیونکہ جو قوتیں اس کی تعمیر کرتی ہیں یعنی انسانی احساسات اور جذبات اور معاشی اور عقلی مقتضیات، وہ باایں ہمہ اختلاف زمان و مکان یکساں ہیں۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ ظاہر میں ہے باطن میں نہیں۔ تہذیب کے جس قافلہ نے غاروں سے محلات تک، پتھر کے اوزاروں سے جوہری بم تک، گدھوں اور ٹٹوؤں کی سواری سے ریلوں اور ہوائی جہازوں تک، برہنگی سے دیبا و حریر کے لباسوں تک، تصویری نقوش سے طباعت تک ترقی کی ہے اس کو سرگرم عمل کرنے والی اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف شوق تجسس، سبقت اور تعمیر کا ذوق ہے جس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اگر کچھ فرق ہوا ہے تو ان کی قوت کارکردگی میں۔ بیل گاڑی ہانکنے والے ابن آدم کے احساسات بھی دراصل محدود پیمانے پر بالکل ویسے ہی تھے جیسے وسیع پیمانہ پر موٹر چلانے والے خاکی پتلے کے۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ رفتار اور ساخت کا ہے۔ جو محرکات آج ہمیں جنگ اور صلح، دوستی اور دشمنی، تعمیر اور تخریب کی طرف لے جاتے ہیں، وہ ان محرکات سے کسی طرح مختلف نہیں جو ازمنہ گذشتہ کے انسانوں کو اسی طرف لے جاتے تھے۔ وہ جذبہ رقابت جو ما قبل از تاریخ کے وحشیوں میں پایا جاتا تھا وہی آج کے مہذب انسانوں میں موجود ہے۔

---

[۱] Civilization on Trial by A. J. Toynbee.

اگر کل غاروں میں رہنے والے غیر مہذب انسان شکار کئے ہوئے گوشت کی تقسیم پر آپس میں سر پھٹول پر آمادہ ہو جاتے تھے تو آج منڈیوں اور نو آبادیوں پر قبضہ جمانے کے لیے اُن سے زیادہ درندگی اور شقاوتِ قلبی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ کل اگر جنگ پتھروں اور تیروں سے ہوتی تھی تو آج ایٹم بم اور کاسمک ریز ایجاد کر لی گئی ہیں۔ فرعون تو صدیاں ہوئیں دُنیا سے نیست و نابود ہو چکا ہے، مگر فرعونیت اپنی پوری آب و تاب سے دنیا میں جلوہ گر ہے۔

تمدن کی ایک خاص رُوح ہوتی ہے جو ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ زندگی کی یہ چنگاری دب سکتی ہے لیکن بجھ نہیں سکتی۔ بس ذرا سی ہوا دینے سے از سرِ نو اسی طرح بھڑک اٹھتی ہے جس طرح پہلے کبھی بھڑکی تھی۔ جس طرح انسانوں کی فطرت چند افراد کے مرنے سے نہیں مرتی بلکہ وہی فطرت اپنا مظہر اُسی قسم کے اور انسانوں کو بنا لیتی ہے، بالکل اسی انداز میں اجتماعی روح ایک قالب کو چھوڑتی ہے تو دوسرے میں جا گزیں ہو جاتی ہے۔ اور پھر نشۂ اختیار کر کے وہ سماج میں ٹھیک اسی طرح کے مظاہر پیدا کرتی ہے۔ آئیے ہم ان واقعات کا تاریخ کی روشنی میں مطالعہ کریں۔

**تمدن اور فنون** سب سے پہلے ہم کسی قوم کے فنون کو لیتے ہیں — کیونکہ یہ فنون ہی وہ سب سے زیادہ حساس آئینے ہیں جن میں ایک قوم کی رُوح بالکل واضح طور پر منعکس ہوتی ہے۔ سماج کے افراد میں جس قسم کے رجحانات ہوں گے اُسی طرز پر ان کے آرٹ کی تکمیل ہو گی۔ خدا شناس تمدن کے اندر جو فنون ترقی پائیں گے اُن کی غرض و غایت اوّل ہی یہ ہو گی کہ انسانی زندگی کو خدا کی مرضی کا پابند بنایا جائے۔ یہاں چونکہ تمدن کے بنیادی فلسفے کی رُو سے انسان دنیا میں خدا کا نائب ہے، اس لیے یہ آرٹ انسانوں کو خدائی اخلاق اپنے اندر پیدا کرنے پر اُبھارتا ہے۔ وہ انسانوں کو نیکی کی تلقین کرتا ہے اور تعمیر پر آمادہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس خدا ناشناس تمدنوں کے فنون ہر اُس چیز پر زور دیتے ہیں جو نیکی، صداقت، راست بازی اور انسانیت کی ضد ہو۔ وہ انسانوں کو بہیمیت اختیار کرنے پر اُکساتے ہیں۔ اس کے دیوتا کبھی بدمعاش، مجرم، عیار اور زانی ہوتے تھے۔ اب وہی کچھ اس کے ہیرو ہوتے ہیں۔ اس کا مقصد زیادہ سے زیادہ شہوانی جذبہ کو اُبھارنا ہوتا ہے۔ اب جہاں کہیں خدا ناشناس تمدن گیا اُس کے ساتھ اسی قسم کے فنون نے ترقی کی۔ یہ آرٹ ازمنۂ گذشتہ

سے بہت سے قبائل کا، پرانے مصریوں کا، اور روم اور یونان کے وسطی دور میں بسنے والوں کا تھا، اور پھر یہی مغربی دنیا میں پچھلے پانچ سو سالوں سے پوری آب و تاب سے جلوہ افروز ہے۔ اسی طرح خدا شناس تمدن نے فنون کو اپنی روح سے متاثر کیا۔ یہ اپنی مخصوص صفات کے ساتھ دنیا میں ابھرا۔ یہ آرٹ کچھ وقت تک تبتیوں میں، بدھ مذہب کے پیروؤں میں، پرانے مصریوں میں اور یونان کے اندر نویں صدی قبل مسیح سے چھٹی صدی قبل مسیح تک پایا گیا ہے۔ پھر جہاں جہاں عیسائیت اور اسلام گئے وہاں اس آرٹ کی ترقی ہوئی۔

**نظامِ زندگی پر تمدن کے وسیع اثرات** | تمدن کی روح صرف آرٹ میں ہی جلوہ گر نہیں ہوتی بلکہ علم و سیاست، معیشت و معاشرت پر بھی اس کے گہرے اثرات پڑتے ہیں۔ یہ اپنے ماننے والوں میں ایک ہی طرح کی ذہنیت پیدا کرتا ہے۔ جب ہم ایک مادی تمدن کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی بنیاد حسیات اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج پر رکھی گئی ہے۔ انسانوں کے لیے اس سے زیادہ آسان اور عام بنیاد اور کوئی نہیں۔ اس سے زیادہ انسانوں کی حیوانی خواہشات کو تسکین دینے والا کوئی نظام نہیں۔ اس لیے یہ عام انسانوں کے لیے سب سے زیادہ کشش کے سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ اِس تمدن کی تحلیل کر کے اگر اُن اجزا کو خارج کر دیا جائے جو اصل نہیں، بلکہ فروعات اور مظاہر ہیں، تو ہم اِس کا ایک مخصوص مزاج پاتے ہیں، جس کی خصوصیات غیر محسوس حقائق کی بے وقعتی اور اُن سے استغناء، خشوع و خضوع اور روحانیت کی کمی، دنیاوی زندگی کی پرستش، اور دنیا کے فوائد و لذائذ کا اہتمام، شدید حُب الوطنی، اور گروہی عصبیت میں افراط و غلو ہیں۔

اب دیکھیے کہ جہاں جہاں یہ تمدن اپنایا گیا زمان و مکان کے وسیع اختلافات کے باوجود اس نے ہر جگہ اور ہر قوم میں ایک ہی قسم کے اثرات چھوڑے۔ باقی افعال کو تو جانے دیجیے، نقشۂ حیات کے خالص مذہبی اور روحانی خانے بھی اسی مادہ پرستانہ ذہنیت سے تابندہ ہو جاتے۔ اس کی روح اسے اپنانے والی قوم کے رگ و پے میں کچھ اس طرح سرایت کر گئی کہ اس کے افراد کا ہر شعوری اور ارادی فعل اُسی کی غمازی کرنے لگا۔

The Crisis of Our Age by Pitirim A. Sorokin. ؎

جہاں تک تاریخ ہماری رہنمائی کرتی ہے سب سے پہلی قوم جس نے اس تمدن کو اپنایا وہ جزیرۃ العرب کی ایک قوم "عاد" تھی۔ اس قوم کی زندگی ایک خالص خدا ناشناس اور منکرِ آخرت قوم کی زندگی تھی۔ وہ بے ضرورت لطف و تفریح یا نام و نمود کے لیے بڑی بڑی عمارتیں اور یادگاریں تعمیر کرتے تھے جن کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ان کے بنانے والے آخرت کو یکسر فراموش کر چکے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ان کو ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہے۔ ان کی دارو گیر سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے سوا کسی بلند و بالا طاقت کا یقین نہیں رکھتے۔

اُس کی جانشین قوم ثمود نے بھی اسی تمدن کا خیر مقدم کیا۔ اس قوم کے افراد کا بھی دنیوی زندگی میں انہماک اور اس ہی اُن کے سکون و اطمینان، اُخروی زندگی سے غفلت اور اس معاملہ میں ان کی بے سرو سامانی دیکھ کر اسی کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی ایسی چیز پر ایمان نہیں رکھتے تھے جو ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو۔ حسیت و مادیت ان کا اصل شعار تھا۔

رومی تمدن بھی اسی حسیت اور مادہ پرستی کا شاہکار ہے۔ اس میں بھی حسی فلسفۂ اخلاق و اجتماع، مادہ پرستانہ مقصدِ زندگی اور طرزِ زندگی پورے طور پر نمایاں ہیں۔ اور خیالات و افکار، علوم و فلسفہ اور تمدن و تہذیب کا یہی ترکہ ہے جو مغرب کو میراث میں ملا ہے۔ رومی تہذیب کی عمارت انہی بنیادوں پر تعمیر ہوتی تھی اور آج مغربی تہذیب کی سر بفلک عمارت بھی اِسی اساس پر اُٹھائی گئی ہے۔ دنیا طلبی اور شکم پروری کا طوفان دونوں میں ایک ہی طرح کا ہے۔ مال و دولت کی ایک نہ مٹنے والی بھوک اور نہ بجھنے والی پیاس دونوں میں ایک ہی جیسی ہے۔ دولت اور عزو جاہ کی کوئی بڑی سے بڑی مقدار اگر رُومی و یونانی تہذیب میں ناکافی محسوس ہوتی تھی تو آج بھی دنیاوی لذائذ کی اونچی سے اونچی سطح بھی انسان کی تشفی نہیں کر سکتی۔

جدید تہذیب کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک نومسلم مفکر نے کہا ہے: "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ میں اس وقت بھی ایسے اشخاص پائے جاتے ہیں جو دینی طرز پر سوچتے ہیں اور مذہبی احساس رکھتے ہیں اور اپنے عقائد کو اپنی تہذیب کی رُوح کے ساتھ منطبق کرنے میں امکانی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن یہ مستثنیٰ مثالیں ہیں۔ یورپ کا عام اور متوسط آدمی، خواہ وہ جمہوری ہو یا فاشستی، سرمایہ دار ہو یا اشتراکی،

ہاتھ سے کام کرنے والا ہو یا دماغی محنت کرنے والا، وہ ایک ہی مذہب جانتا ہے۔ وہ کیا؟ مادّی ترقی کی پرستش! اور یہ عقیدہ کہ اس زندگی کی غرض و غایت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ آسان اور پُر راحت اور بے قید بنایا جائے۔ اس مذہب کے گرجے اور عبادت گاہیں زبردست کارخانے، تھیٹر، تفریح گاہیں، کیمیاوی دار الصنعت، ناچ گھر اور بجلی کے مراکز ہیں! اس مذہب کے پروہت بینکوں کے ڈائرکٹرز، انجینئرز، فلم اسٹارز اور تجارت و صنعت کی بڑی بڑی مرکزی شخصیتیں اور ریکارڈ قائم کرنے والے ہوا باز ہیں۔ طاقت و لذت کی اس ہوس اور چھچھورپن کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ حریف گروہ سامان جنگ سے لیس اور جنگی تیاریوں سے مکمل تیار کھڑے ہیں اور ایک دوسرے کو تباہ کر دینے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ اب اگر ان کی خواہشات اور مصالح میں تصادم ہو گیا تو کون جانے کیا ہو گا! جہاں تک تہذیب کا تعلق ہے، انسانوں کا ایک ایسا ٹائپ پیدا ہوا ہے جس کا عقیدہ ہے کہ نیکی اور اخلاق نام ہے مادّی فائدے کا۔ اس کے نزدیک کامیابی کا معیار محض مادّی کامیابی ہے[1]۔"

تہذیب کے اصولوں کا بار بار نمودار ہونا یہ تو ہوا اقوام کا مزاج اجتماعی جس میں اس قدر یگانگت دیکھنے میں آتی ہے۔ آئیے اب تہذیب کے چند اصولوں کو لیجیے اور پھر دیکھیے کہ یہ مسائل کس طرح ہمارے سامنے بار بار اُبھرتے رہے ہیں اور ایک ہی نظریۂ حیات رکھنے والی مختلف اقوام کس طرح شعوری یا غیر شعوری طور پر ان مسائل کو ایک ہی طرح سے حل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

بطورِ مثال ایک سوال کو لیجیے کہ فرد اور اجتماع کا رابطہ کیا ہونا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عہدِ قدیم میں کوئی واضح اور مضبوط نظام نہیں تھا لیکن یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہاں نظم اجتماعی کی کوئی ہیئت ہی نہ ہو۔ اس نظام نے انفرادی آزادی کو انتہا تک پہنچا دیا تھا یعنی اجتماعی ہیئت فرد کے سامنے بالکل بے بس تھی پھر اس کا رد عمل کے اندر شہنشاہیت کی شکل میں رد عمل ہوا۔ فرد کی شخصیت بالکل اجتماعیت کی محکوم بن کر رہ گئی اور فرد کی جان و مال قوم اور ملک کی بھینٹ چڑھنے لگی پھر انقلاب فرانس کے دور میں واقعات نے یک لخت پلٹا کھایا اور فرد کو مکمل آزادی نصیب ہوئی۔ پھر اشتراکی روس اور نازی جرمنی

---

[1] Islam at the Cross roads by Mohammad Asad.

میں اس کے خلاف تحریکات اٹھیں اور فرد اجتماعیت کے طوفان میں بالکل غرق ہو کر رہ گیا۔ جرمنی کے وزیر خلہ نے کہا تھا کہ ہٹلر کی خدمت کرنا جرمنی کی خدمت کرنا ہے، اور جرمنی کی خدمت کرنا خدا کی عبادت ہے۔
اشتراکی ریاست اس سے بھی ایک قدم آگے ہے۔ وہاں انسانوں کو حکومت کی رکشا میں صرف جوتا نہیں جاتا بلکہ ان کے دل و دماغ پر مکمل قبضہ کر کے ان کے جذبات اور احساسات تک کی مکمل منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ آپ روس کے صدر کو جس نام سے چاہیں پکاریں مگر اُس کے اختیار اور اقتدار کا دائرہ کسی طرح ہٹلر اور مسولینی سے کم نہیں۔ اس کی ہر بات روس کا قانون ہے۔ ہٹلر اور سٹالین ایک ہی سیاسی تہذیب کے دو مظہر ہیں، اگرچہ باہم بر سر پیکار نظر آتے ہیں۔ فاشزم اور کمیونزم سیاسی منصوبہ بندی ہی کے دو پہلو ہیں۔ اگر بونا پارٹ اپنے عہد میں خفیہ پولیس کے سہاروں پر زندہ رہا، اگر قرون وسطیٰ کے بادشاہ تلواروں کی مدد سے مسندِ اقتدار پر متمکن رہے تو آج کی دنیا کا سٹالن بھی گے۔ پی۔ یو کے بل بوتے پر جی رہا ہے۔
مزید مثال کے لیے انسان کے صنفی رابطے کو لیجیے۔ دورِ وحشت میں یہ تعلق بالکل جانوروں کی طرح تھا۔ جہاں جذبات میں ذرا سی تحریک ہوئی صنفِ مخالف کے کسی فرد سے استفادہ کر لیا۔ اس دور سے ذرا آگے نکل کر نکاح کے معاہدے کو صنفی تعلقات کی اساس بنایا گیا۔ پھر خاندان معرضِ وجود میں آیا۔ کچھ مدت گزرنے کے بعد موجودہ علوم کے باوا آدم یعنی افلاطون نے دورِ جاہلیت کے صنفی تعلقات کی طرف عوام کو پھر دعوت دی۔ اس نے تجویز کیا کہ مقررہ اوقات پر تندرست مردوں اور عورتوں کو یکجا کر دیا جائے۔ ان کے اختلاط سے جو اولاد پیدا ہو گی ان کو اپنے ماں باپ کا علم نہیں ہو گا۔ ریاست ان بچوں کی خود پرورش کرے تاکہ ہر نئی نسل پرانی نسل کو اپنا والدین سمجھے اور کسی شخص کی محبت و عطوفت کا مرکز کوئی خاص بچہ نہ ہو سکے۔ اس طور پر ملک میں محبت و ہمدردی کا عام جذبہ پیدا ہو گا[ا] — کتنی بڑی فاش غلطی ہے اور کتنا بڑا عاقل شخص ریاست کے مفادِ عمومی کی بے پناہ محبت میں کس طرح اعتدال کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑ رہا ہے!
کچھ مدت کے بعد خاندانی سسٹم کی جڑیں پھر مضبوط ہو گئیں لیکن دورِ جدید میں پھر باد مخالف چلی

ا۔ Plato — the Republic Book V, VI, VII.

اور خصوصاً اشتراکی انقلاب کے آغاز میں تو صنفی انارکی کا وہ طوفان اٹھا جس نے زمانہ جاہلیت کی یاد از سر نو تازہ کر دی۔ اس کے ثبوت کے لیے "سویٹ اشتراکیت بہ حیثیت ایک نئی تہذیب کے" سے ایک عبارت نقل کی جاتی ہے :-

"بالشوک نظام کے چند ابتدائی سالوں میں یہ خیال عام تھا کہ صنفی تعلق ایک ایسا ذاتی معاملہ ہے جو مختلف نسلوں، رنگوں اور مذہب کے حامی مردوں اور عورتوں میں ان کی باہمی رضامندی سے طے ہوتا ہے۔ اس کے لیے سرکاری اندراج بھی ضروری نہیں۔ یہ جوڑے کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے۔"

چند سال گزرنے کے بعد لوگوں کے نقطۂ نظر میں تبدیلی ہوئی۔ لینن نے صنفی روابط میں آوارگی کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اُسے اِس نظریہ سے شدید اختلاف تھا کہ صنفی جذبات کی تسکین پانی کا گلاس پی لینے کے مترادف سمجھی جائے۔ ریازانوف (Ryazanov) نے کہا "کیا نکاح دو ٹانگیں رکھنے والے جانوروں کے درمیان ایک ذاتی معاملہ ہے جس کا تعلق محض ایک مرد و عورت سے ہے اور جس میں سماج کو دخل اندازی کا کوئی حق نہیں پہنچتا؟ ہمیں نوجوان اشتراکیوں کو سمجھانا ہے کہ عقد نکاح کسی فرد کا کوئی ذاتی فعل نہیں بلکہ معاشرتی نقطۂ نظر سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ نکاح کے دو پہلو ہیں ایک ذاتی، دوسرا معاشرتی۔ اور ہمیں اس کے معاشرتی پہلو کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا ہے۔ ہم آوارہ زندگی کے سخت مخالف ہیں کیوں کہ اس کا اثر بچوں پر پڑتا ہے[1]۔" چنانچہ "بعد از خرابی بسیار" خاندان اور نکاح کے نظام کو اب پھر سے وہاں زندہ کیا جا رہا ہے۔

آگے چلیے شوریٰ اور جمہوریت کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے۔ یہ نعمت عظمیٰ تو بالکل جدید دکھائی دیتی ہے۔ حالانکہ عرب، یونان اور قرون وسطیٰ کے ہندوستان سے بھی آگے نکل جائیے اور زمانۂ قبل از تاریخ میں اس کا سراغ لگائیے تو وہاں بھی جمہوریت اور شوریٰ کے تحائف موجود ملتے ہیں۔ یہ سب حقائق

[1] Soviet Communism—A New Civilization by Sidney and Beatrice Webb

ایک ہی نتیجہ پر منتہی ہوتے ہیں کہ زمان و مکان بدلتے رہے، قومیں دُنیا کے سٹیج پر آتی اور جاتی رہیں، لیکن ہر دو قسم کے اصول نمودار ہوتے رہے۔ خود مادہ پرستانہ تمدن کبھی مصر اور شام میں جلوہ گر ہوا، کبھی عراق و ایران اس کے علم بردار بنے، کبھی روم اور یونان اس کے زیر اثر آ گئے، اور اب یہ مغربی اقوام پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ ان سب کے اندر ایک ہی تہذیب نے فکر و عمل کی ایک ہی لہر دوڑائی ہے اور سب اقوام — جدید و قدیم — کے سامنے ایک ہی طرح کے مسائل پیش کئے ہیں اور پھر انہوں نے ان تمام مسائل کو ایک مخصوص اندازِ فکر سے سُلجھایا ہے۔ اس تمدن کے علمبرداروں میں، خواہ وہ کسی عہد اور کسی ملک کے رہنے والے تھے، بار بار ایک ہی طرح کے تموج رونما ہوتے رہے اور ان کے جذبات و احساسات میں ایک ہی نوعیت کے طوفان پھر پھر کر تلاطم برپا کرتے رہے۔ ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ ان مختلف اقوام کے ظاہری اختلافات کے باوجود جن عقلی اور اخلاقی عناصر سے اس تمدن کی ترتیب ہوئی وہ ایک ہیں۔ چنانچہ اُن کے فکر و عمل کا رقاص اپنے مادی چوکھٹے میں نصب ہونے کی وجہ سے قدرتاً صرف حیوانی زندگی کی لذت و مسرت کے مابین ہی رقص کرنے پر مجبور ہے۔

**تکرار ایک فطری اصول ہے** "تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ" کا تماشہ صرف مٹی کے کرۂ پر ہی نہیں، بلکہ انسان کی اجتماعی زندگی میں بھی دکھایا جا رہا ہے۔ جس طرح آب و گِل کی دنیا کا کچھ حصہ رات کی تاریکی میں اپنا منہ چھپا لیتا ہے اور بقیہ حصہ سورج کی شعاعوں سے منور ہو جاتا ہے بالکل اسی انداز میں جب کبھی انسان کی اجتماعی زندگی پر دینِ حق کا آفتاب چمکنے لگتا ہے تو روشن دورِ تہذیب کی صبح نمودار ہوتی ہے۔ وہ تہذیب جو تسکین بخش ہے، جس میں جوہرِ انسانیت بدرجۂ کمال ہے، جو اپنے دامن میں استقامت اور صبر و سکون کے خزائن رکھتی ہے، جو انسانوں کے دامن کو ناجائز خود غرضی اور ناجائز نفع اندوزی سے پاک رکھتی ہے۔ اس کے برعکس جب رات کی تاریکی کی طرح ایک خدا ناشناس تمدن نوعِ انسانی کو اپنے بھیانک پردوں میں چھپا لیتا ہے تو انسانی زندگی پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ نوعِ انسانی کے سارے کے سارے سفلی جذبات اُبھر کر سطح پر آ جاتے ہیں۔ وحشت و بربریت خواہ ترقی کے کیسے ہی خوشنما لباس پہن کر جلوہ افروز ہو، بہرحال دنیا کو اہلِ دنیا کے لئے جہنم بنا دیتی ہے۔

لیکن دن رات کے چکر میں اور تمدنوں کی گردش میں ایک نہایت اہم فرق ہے، جس کو کسی صورت میں بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ عالمِ طبیعیات قانونِ فطرت کے ایک اٹل قانون کا پابند ہے جس سے کسی صورت بھی مفر نہیں۔ ایک خاص وقفہ گزر جانے کے بعد رات کو بہرحال آنا ہے۔ پھر رات کے بعد صبح کو ضرور نمودار ہونا ہے۔ چکر کو کسی طرح روکا نہیں جا سکتا۔ مگر تہذیبوں کا معاملہ اور نظریات اور قوموں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ان سب کا محرک ایک ارادہ ہے جس کا تمام تر انحصار انسانوں کے اپنے انتخاب پر ہے۔ اس لئے اگر مختلف تمدنوں کو دنیا میں عروج و زوال آتا ہے تو یہ اُن کے علم برداروں کی توجہ اور عدم توجہ کا نتیجہ ہے۔ اہلِ مغرب نے ہزار ہا سالوں کی متعفن رومی تہذیب کو پھر سے زندہ کیا ہے۔ اور اگرچہ موجودہ دنیا اُس کے تلخ ثمرات کا بُری طرح مزہ چکھ چکی ہے مگر پھر بھی وہ اس وقت تک غالب ہے۔ کیونکہ اس کے فدائی ایک نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں انسان ہیں۔ وہ زندگی کے ہر مقصد کو اسی عینک سے دیکھتے ہیں۔ اپنی ہر مشکل کو اپنے تہذیبی اصولوں سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں انہیں اپنی تہذیب پر اعتماد ہے۔ محض قرطاس کے خزانہ میں محفوظ تمدن کبھی بھی زندگی کی نعمت کو پا نہیں سکتا۔ اس کی زندگی کے لیے ناگزیر ہے کہ ایسے انسان اٹھیں جو اپنے اعمال کی تصویر میں اس کے رنگ بھرنے کے لیے تیار ہوں۔ صرف تیار ہی نہ ہوں، بلکہ اس کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لئے کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی گریز نہ کریں۔

انسان کی اجتماعی زندگی میں سارا کھیل فکر و عمل کا ہے۔ کوئی تمدن بھی کسی قوم کی میراث نہیں۔ جو بھی جس طرف قدم اُٹھائے یہ اُس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ سارا معاملہ اس کے علمبرداروں کی نیت، وابستگی، ایثار اور قوتِ کارکردگی پر منحصر ہے۔

**حیوانی نقطۂ نظر** اسے انسان کی بدقسمتی کہیئے کہ جدید فلسفہ کی بنیاد ڈارون کی کتاب اصل الانواع (Origin of Species) پر رکھی گئی ہے جس کی رُو سے انسان کو بھی ایک حیوان سمجھا گیا ہے اور انسان کی اجتماعی زندگی کو ایک نظامِ جسمانی پر قیاس کر کے از خود فرض کر لیا گیا ہے کہ جو قانون انسانوں کی زندگی اور موت پر جاری ہے وہی تہذیب کی حیات و ممات پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ لہٰذا جو تہذیب

ایک دفعہ وجود میں آگئی ہے اُسے انسانی زندگی کی ساری منازل میں سے گزر کر بالآخر موت کی آغوش میں جا گرتا ہے۔ حقیقت اس سے مختلف ہے۔ انسان کی اجتماعی زندگی، زندگی اور موت کے اس قانون طبعی کی پابند نہیں ہو سکتی۔ قوموں کی اجتماعی روح اپنے قالب تو بدل سکتی ہے مگر ختم نہیں ہو سکتی۔ اس پر تناسخ کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ایک قالب کو چھوڑتی اور دوسرے میں جاگزیں ہوتی ہے۔ مگر دنیا سے ناپید نہیں ہوتی۔ رومی مٹ چکے ہیں۔ یونانی دنیا کی امامت سے ہٹا دیے گئے ہیں۔ ایرانی وعربی خوشحالی کی زندگی بسر کر کے اس سے محروم ہو گئے ہیں۔ مگر اُن کے مدفن میں اُن کی تہذیبی روح کبھی دفن نہیں کی جا سکتی، وہ زندہ رہتی ہے اور جو قوم بھی اُس کو دعوت دے وہ اس کی آواز پر لبیک کہہ کر اُس کے جسم میں نشیمن بنا لیتی ہے۔ لیکن شپنگلر اور اُس کے ساتھیوں نے اس زبردست حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ ایک تمدن جو ایک دفعہ فنا کے گھاٹ اُتر چکا ہے اُس کے بقا کی دوبارہ کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔

**تمدن کا تحریکی نظریہ** معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ جن لوگوں نے بھی تمدن سے متعلق یہ نظریہ پیش کیا ہے وہ ابھی تک یقین کے ساتھ یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ تمدن کی طفولیت اور تمدن کے شباب سے اُن کی کیا مراد ہے۔ اُن کی سرحدیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں اور کہاں ختم ہوتی ہیں۔ ایک تمدن کب اور کس وقت آتا ہے۔ اور اس کی موت کا کیا مطلب ہے۔ اس نقطۂ نظر سے یہ بطوری غیر واضح الفاظ کا ایک گورکھ دھندا ہے۔ جس طرح ایک شخص ایک خاص طرز زندگی چھوڑ کر دوسرا طرز اختیار کر لیتا ہے تو یہ تبدیلی اس کی موت نہیں سمجھی جا سکتی، اسی طرح ایک تمدن کی ظاہری شکل میں کوئی معمولی تبدیلی اس کی موت نہیں سمجھی جا سکتی۔ تمدن ایک نظام جسمانی نہیں بلکہ یہ ایک تحریک ہے جو کمزور تو پڑ سکتی ہے مگر مٹ نہیں سکتی۔ افراد جلد جلد مٹنے والے ہیں۔ لیکن قومیں اپنی آئندہ نسلوں کے ذریعے اپنی زندگی کو دائمی بنا لیتی ہیں۔ ان کی زندگی غیر منقطع ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو عالم اسلام کے مفکر علامہ اقبال مرحوم نے رموز بے خودی میں استعارہ اور تشبیہ کی زبان میں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ باوجود گل و نسترن کے مرجھا جانے کے فصل بہاراں باقی رہتی ہے۔ گوہر دل کی کان میں سے اگر دو ایک گوہر نکل جائیں تو اس پر کچھ اثر نہ پڑے گا اور

نہ اس میں کسی قسم کی کمی محسوس کی جائے گی۔ خمِ ایام میں سے روز و شب ان گنت جام کے جام پے در پے میخوارانِ حیات کو ملتے ہیں۔ لیکن وہ جیسا تھا ویسا ہی ہے۔ اس طرح ملت کی تقویم فرد کی تقویم سے جداگانہ ہے۔ اور اس کی مرگ و حیات کا قانون بھی مختلف ہے۔

فصلِ گل از نسترن باقی تر است     از گل و سرو و سمن باقی تر است
کانِ گوہر پرورے گوہر گرے     کم نہ گردد از شکستِ گوہرے
صبح از مشرق ز مغرب شام رفت     جامِ صد روز از خمِ ایام رفت
بادہ ہا خوردند و صہبا باقی است     دوش ہا خوں گشت و فردا باقی است
ہم چناں از فرد ہائے پے سپر     ہست تقویمِ اُمم پایندہ تر
در سفر یار است و صحبت قائم است     فرد رہ گیر است و ملت قائم است
ذات او دیگر صفاتش دیگر است     سنتِ مرگ و حیاتش دیگر است
فرد را شصت است یا ہفتاد است و بس     قوم را صد سال مثلِ یک نفس!

یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنی شہرہ آفاق کتاب اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل میں شپنگلر کے اسی نظریہ سے متعلق بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے "شپنگلر اپنے نظریہ تمدن کے مطابق یہ کہتے ہوئے کہ ہر تمدن ایک خاص نظامِ جسمانی ہے جس کا دوسرے تمدنوں سے جو پہلے گزر چکے ہیں کوئی دور کا بھی تعلق نہیں، یہ دعوے کرتا ہے کہ جدید یورپین تہذیب روح کے اعتبار سے بالکل غیر کلاسیکی ہے، اور اس کے ثبوت میں وہ واقعات اور حقائق کو بری طرح مسخ کر کے پیش کرتا ہے۔ وہ ثابت کرتا ہے کہ یورپ کی غیر کلاسیکی روح یورپ کی مخصوص ذہانت کی رہینِ منت ہے جس میں اسلامی تمدن کی روح کو کوئی دخل نہیں۔ میں نے ان لیکچروں میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جدید دنیا کی غیر کلاسیکی روح اسلام کی یونانی افکار کے خلاف بغاوت کی پیداوار ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ شپنگلر اس نظریہ کو کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ موجودہ تمدن میں گزرے ہوئے تمدن کی روحانی تاثیر بھی شامل ہے، تو اس سے شپنگلر کے اس فلسفے کی کہ ہر تمدن اپنی اپنی جگہ خود مختار اور ایک دوسرے سے بے تعلق ہے۔

پوری عمارت پیوندِ خاک ہو جاتی ہے[1]۔ شپنگلر نے اپنے دعوے کی تائید حاصل کرنے کے لئے اسلام کی روح کو بحیثیت ایک تمدنی تحریک کے بالکل مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ موجودہ تمدن نے بہت کچھ عربوں سے لیا۔ عربوں کی ترجمہ کی ہوئی کتابوں ـــــ علی الخصوص علمی کتابوں ـــــ پر پانچ چھ صدی تک یورپ کے کل دارالعلوموں کی تعلیم کا دار و مدار رہا۔ بعض علوم میں مثلاً طب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عربوں کا تسلط خود ہمارے زمانے تک رہا ہے۔ کیونکہ گذشتہ صدی کے آخر تک فرانس میں ابن سینا کی تصنیفات پر شروح لکھی جاتی تھیں۔ اسلامی تمدن نے یورپی تمدن کو اس حد تک متاثر کیا کہ موسیو لیبان کو لکھنا پڑا کہ

> "تجربہ اور مشاہدہ کو اقوال اساتذہ کی روشنی کے مقابلہ میں تحقیقاتِ علمی کے اصول قرار دینا عموماً بیکن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، لیکن اس وقت تسلیم کر لینا چاہیے کہ اس کے موجد عرب تھے[2]۔"

(باقی)

---

[1] Reconstruction of Metaphysical Thought in Islam.

[2] تمدن عرب از گستاؤلیبان۔

# پروڈا کا مطالعہ[۱]

نعیم صدیقی

کسی قوم کے سیاسی مقام اور اس کے حکمراں گروہ کی ذہنیت کا مطالعہ جتنا اچھی طرح اس کی قانون سازی کی تاریخ سے لگایا جا سکتا ہے، شاید اور کسی طرح نہیں لگایا جا سکتا۔ جس طرح ایک فرد کے خوابوں کو سُن کر ایک ماہرِ تجزیۂ نفس اس کی ذہنی صحت یا اس کے ذہنی اختلال کو معلوم کر لیتا ہے، بالکل اسی طرح ایک ریاست کے دستور یا اس کے قانون کا تجزیہ کرنے سے حکمراں گروہ کی ذہنی ساخت اور اس کا طرزِ فکر نمایاں ہو کے سامنے آجاتا ہے۔ قوانین کی دفعات، ان کے دیباچے (Preambles)، ان کے الفاظ، ان کا دائرۂ اثر، ان پر عملدرآمد کے ضوابط، ان کے پیدا کردہ حقوق اور ان کے عطا کردہ اختیارات یہ حقیقت کھول کے سامنے رکھ دیتے ہیں کہ ریاست کا برسرِ اقتدار گروہ کس اصول اور نظریہ پر کاربند ہے، یا وہ سرے سے کوئی اصول ہی نہیں رکھتا، محض ایک مفاد پرست اور موقع شناس ٹیم ہے جو اقتدار کا میچ جیتنے کے لئے ہر طرح کی چالیں چل رہی ہے۔ پھر قانون سازی کا مزاج اس بات کی غمازی بھی کر دیتا ہے کہ مقتدر ٹولی عوامی اعتماد کے بل پر کام کر رہی ہے یا جبر و تشدد اور مکر و افسوں کے بل پر خواہ مخواہ عوام کے کندھوں پر لدی ہوئی ہے۔ قانون سازی کی نوعیت اس راز کو بھی افشا کر دیتی ہے کہ کار پردازانِ سلطنت ٹھوس کیرکٹر کے لوگ ہیں اور ان میں کوئی حقیقی یکجہتی ہے، یا ان کی سیرت میں جھول ہے اور آپس میں ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔ قانون سازی کی فطرت یہ شہادت بھی بہم پہنچاتی ہے کہ حکومت آیا دلیل سے اپنی بات منوانے والی ہے یا دلائل میں کمزور ہونے کی وجہ سے ڈنڈے سے دلیل کا کام لینے کی خوگر ہے۔

---

[۱] پروڈا۔ P.R.O.D.A. مخفف ہے Public and Representative Offices Disqualification Act (1949) کا!

**فوقیت یافتہ عنصر اور قانون سازی**

دنیا کے جس ملک میں کوئی فوقیت یافتہ طبقہ ( Privileged Class ) یا کوئی فوقیت یافتہ تنظیم ( Privileged Party ) موجود ہوگی اس ملک میں جب تک کوئی اصولی تحریک پورے نظام کو بدل نہ دے، قانون سازی میں اسی فوقیت یافتہ عنصر کی ذہنیت بول رہی ہوگی اور حکومت اور قانون اور نظم و نسق تمام کا تمام اسی کے مفاد کے محور پر گھومتا رہے گا۔ سب سے پہلے تو جو دستور بنے گا ان اس کی بنیادوں میں فوقیت یافتہ عنصر کے امتیازی حقوق و اختیارات پیوست ہوں گے۔ پھر وہ لازماً اپنی فوقیت اور اپنی امتیازی حیثیت کے تحفظ کے لئے چند مستبدانہ قوانین وجود میں لائے گا جن کو وہ حق اور دلیل کی طاقت کے خلاف بوقتِ ضرورت استعمال کر سکے۔ مگر اکتفا اتنے ہی پر نہیں ہوگا، بلکہ ان مستبدانہ قوانین کی روحِ استبداد بقیہ پوری قانون سازی میں سرایت کر جائے گی، اور ایک ناقد نظر اسے گہرے مطالعہ سے بظاہر بڑے معصوم قوانین کا بھی جائزہ لے گا تو وہ دیکھے گا کہ یہ سب ایک ہی شجرۂ خبیثہ کے شگوفے ہیں۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ درحقیقت کسی ملک کا ایک ایک قانون بجائے خود مستقل حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ پورا نظامِ قانونی ایک "کُل" ہوتا ہے جس کے تمام اجزا باہم دگر مربوط ہوتے ہیں۔ اس کی شاخیں اور کونپلیں اور پتے جہاں تک بھی پھیل جائیں اس کا تنا اور اس کی جڑ ایک ہی ہوتی ہے، ساری شاخوں اور کونپلوں کو ایک ہی قسم کی غذا ملتی ہے۔ قانون کا پورا عضویاتی نظام ایک ہی ریڑھ کی ہڈی رکھتا ہے۔

**پاکستان میں قانون سازی کا پس منظر**

ظاہر بات ہے کہ ہمارے ملک میں ایک فوقیت یافتہ Privileged طبقہ موجود ہے جو ہمارے بہت سے زمینداروں، جاگیرداروں، نوابوں اور چند کارخانہ داروں اور تاجروں پر مشتمل ہے۔ تقسیمِ ہند سے قبل یہ طبقہ انگریز کی سرپرستی میں بلکہ انگریز کے باقاعدہ منصوبے کے مطابق دنیائے سیاست میں ارتقا کی منزلیں طے کرتا رہا ہے۔ اس طبقے کے چند نمایاں سیاسی افراد ہی تھے جو مسلم لیگ کی تحریک کے سربراہ کار بنے اور آخر جب ملک تقسیم ہوا تو انگریز نے اپنی جانشینی کے لئے سب سے زیادہ موزوں انہی کو پایا، کیونکہ آگے چل کر ہندو پاکستان سے جو فائدے اسے اٹھانے تھے ان کے لئے یہ تربیت یافتہ لوگ ہی مفید مطلب ہو سکتے تھے۔ بنابریں اس نے "اقتدار" کو عوام کے حوالے کرنے کے بجائے یہاں سے رخصت ہوتے وقت یہ غصب کردہ امانت اپنی منظورِ نظر ٹیم کے حوالے کر دی۔ حکومت پہلے ہی ایک

خاص فوقیت یافتہ طبقے کے تابع مفاد تھی۔ مگر اب اس فوقیت یافتہ طبقے ہی سے بھی وہ ان چند منتخب روزگار ہستیوں کی تحویل میں چلی گئی جو خود اپنے ہی طبقے کی دوسری ٹولیوں کی حریف تھیں!

ان حضرات کو جب ایک آزاد ملک کی مسندِ اقتدار پر بیٹھنے کا موقع ملا تو ان کے اصل جوہر کھلنے شروع ہوئے۔ یہ جوہر کھلے تو مسلم لیگ کی مقبولیت ختم ہونے لگی۔ مسلم لیگ کی مقبولیت میں زوال آیا تو رائے عام میں نئی نکی لہریں اُٹھنے لگیں۔ یہ لہریں اُٹھنے لگیں تو اوپر خطرات ہی خطرات محسوس کئے جانے لگے۔ خطرات محسوس ہوئے تو آپ سے آپ ایک ایمرجنسی کی حالت پیدا ہو گئی۔ اس ایمرجنسی کی حالت نے سیفٹی ایکٹوں اور سیفٹی آرڈی ننسوں کو جنم دیا، اور پھر یہ "سیفٹی" کی روح پورے قانونی نظام میں سرایت کر گئی۔

اس تاریخی مطالعے کی روشنی میں دنیا کا کوئی سمجھ دار آدمی چاہے تو پاکستان کے قوانین کو دیکھنے سے پہلے ہی بڑی اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہے کہ ان حالات میں ہمارے ہاں کی قانون سازی کا رُخ کیا ہوگا، اس کا مزاج کیسا ہو سکتا ہے، اس میں حکمراں گروہ کی ذہنیت کا پرتو کس رنگ میں جھلکنے کی توقع کی جا سکتی ہے، اس کی نگاہ میں عوام کے شہری حقوق کی قدر و قیمت کیا ہو گی، وہ اصول اور نقطۂ نظر کے اختلاف کی کہاں تک گنجائش دے سکے گی، عدالتوں کے اختیارات کی حدود کو وہ کتنا محدود کرے گی، پریس اور اسٹیج سے وہ کیا سلوک کریگی، اور حکمراں طاقت کو وہ کس حد تک خصوصی اور مستبدانہ اختیارات سے مسلح کرے گی۔

یہ تمام اندازے جو ایک شخص یہاں کے سیاسی پس منظر کو جان لینے کے بعد کرے گا، اس کی پوری تصدیق یہاں کے قوانین کو دیکھنے سے ہو جائے گی۔ ہمارا سر عالم انسانیت کے سامنے اس سارے دفترِ قانون پر ندامت سے جھک جانا چاہیے جو تقسیم کے بعد مرتب ہوا ہے[1]۔

**پروڈا کا مطالعہ** سر دست ہم قانون سازی کے پورے کارنامے پر تبصرہ کرنے کے بجائے نامی گرامی قانون

---

[1] یہ حقیقت مزید افسوسناک ہے کہ ایک ایک کر کے مستبدانہ قوانین نافذ ہوتے چلے جا رہے ہیں اور محدود مدت کے لئے نہیں بلکہ ہماری کتاب آئین کے مستقل ابواب بن رہے ہیں، لیکن قوم خاموشی سے ان کو انگیز کرتی جا رہی ہے، کیونکہ رائے عام کو بنانے والی طاقتیں خود فرض ناشناس ہیں۔

"پروڈا" پر تفصیلی نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ ہم اس قانون کا باقاعدہ تجزیہ کر کے اس کے پیچھے کام کرنے والے خاص محرکات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں اور اس کی گہرائی میں اتر کر اس کے حقیقی مقاصد کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ پروڈا کسی پس ماندہ رجواڑے کا قانون نہیں ہے، یہ کسی صوبائی حکومت کا بنایا ہوا نہیں ہے، بلکہ مرکز کا مدون کردہ ہے۔ ماہرین قانون نے اس کی تسوید کی ہے اور گورنر جنرل نے اسے آرڈی ننس کی حیثیت سے نافذ کیا ہے اور مرکز ہی نے اسے چند مرتبہ استعمال کیا ہے۔ پس "پروڈا" ہمارے حکمرانوں کے مخصوص رجحانات کا زیادہ سے زیادہ آئینہ دار ہے۔

**ایک معقول نظامِ قانون کی تعریف** ہمارا معیارِ نقد و تبصرہ اسلامی اصولِ عدل و قانون ہیں، اور جو لوگ اسلام کو نہ جانتے ہوں ان سے ہم توقع کرتے ہیں کہ خالص عقلی طور پر بھی مندرجہ ذیل امور کو ایک معقول نظامِ قانونی میں وہ کارفرما دیکھنا چاہتے ہوں گے:

(۱) قانون کی نگاہ میں ادنیٰ سے ادنیٰ شہری اعلیٰ سے اعلیٰ شہری کے برابر ہو اور قانون ایک جیسے حالات میں دونوں سے ایک جیسا معاملہ کرے۔

(۲) ایک جیسے جرائم کی سارے شہریوں کے لئے ایک ہی جیسی سزا ہونی چاہیے۔

(۳) ایک جرم اپنے پیمانۂ اثر اور اپنے فحش پن کے لحاظ سے جتنا زیادہ وسیع اور شدید ہوتا جائے، اس کی سزا بھی اتنی ہی زیادہ شدید اور وسیع الاثر ہونی چاہیے۔

(۴) عام شہری اور حکمراں جب ایک ہی جرم کے مرتکب ہوں تو دونوں کے لیے عدالتی نظم اور ضابطۂ کارروائی ( Procedure ) بھی ایک ہی ہونا چاہیے، اور دونوں کے لیے ایک ہی قانون کی لاٹھی حرکت میں آنی چاہیے۔

(۵) جن معاملات میں انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا عدلیہ کا کام ہو ان میں انتظامی طاقت کو نہ تو مداخلت کرنی چاہیے، نہ عدالت کے ہاتھ باندھ کر اس سے کچھ اختیارات اپنے لئے سلب کر لینے چاہئیں اور نہ عدالتی فیصلوں میں رد و بدل کرنے کی طاقت اپنے ہاتھ میں لینی چاہیے۔

(۶) کسی شہری یا کسی سرکاری کارکن کو کوئی سزا بغیر اس صورت کے نہ دی جائے (اور نہ اس پر کوئی پابندی

لگائی جائے) کہ اس کے معاملہ میں باقاعدہ عدالتی کارروائی تکمیل پا کر ایک عدالتی فیصلہ نافذ ہو۔

(د) جائز اور معقول قانون وہ ہے جس کی تدوین و ترمیم میں ٹھوس اخلاقی اصولوں اور اجتماعی مفاد کو معیار بنایا گیا ہو، نہ کہ بعض افراد اور بعض خاص طاقتوں کو۔

ان نکات میں تو کسی غیر مسلم کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا! اب آپ اسلام سے قطع نظر کر کے بھی پروڈا کا مطالعہ کر لیجیے، اور پھر بتائیے کہ یہ قانون سازی کی کس نوعیت کا مظہر ہے۔

**پروڈا کی شانِ نزول** یہ تو ایک معمولی سی بات ہے کہ کسی نازک صورتِ حالات (Emergency) کے نمودار ہو جانے پر حکومتوں کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں اور ان کو معمولی حالات کے مقابلے میں زیادہ وسیع اختیارات استعمال کر کے بہت سی خاص تدابیر امن و نظم کے تحفظ کے لئے اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ یہ سوال کہ ایک حکومت ایمرجنسی کی صورت میں کہاں تک جا سکتی ہے، اسلام میں تو طے شدہ ہے۔ اسلامی دستوریات کی رُو سے قانون و عدل کے جو تقاضے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں ان کو ایمرجنسی کے نام پر ذبح نہیں کیا جا سکتا۔[1]

[1] مدینہ کی ریاست جب تک نبی صلعم کی امارت کے تحت چلی ہے، یہ پورے کا پورا دور شدید قسم کی ایمرجنسی اور نازک صورتِ حالات کا دَور تھا۔ ایک چھوٹی سی نئی ریاست جو چاروں طرف سے دشمنوں میں گھری ہوئی تھی، جس کے سامنے مسلسل آنے والے مہاجرین کی بحالی کا غیر مختتم سا کام تھا، جو دن رات لڑائیوں میں مصروف تھی، جس کے مالیات صفر سے آغاز پذیر ہوئے تھے اور جس کے عین مرکز میں یہود کی دشمن طاقت کی سازشوں کے علاوہ منافقین کی فتنہ انگیزیاں روز افزوں تھیں۔ اگر ایمرجنسی کے نام پر سخت گیرانہ قوانین بنانے اور مستبدانہ اختیارات حاصل کرنے کی کوئی گنجائش اسلام میں ہوتی تو اس گنجائش سے فائدہ اٹھانے کی سب سے زیادہ مستحق مدینہ ہی کی ریاست ہوتی۔ مگر کیا کوئی شخص دعوےٰ کر سکتا ہے کہ اس ریاست میں ایمرجنسی کے نام پر کوئی ایک سخت گیرانہ ہنگامی قانون بھی نافذ کیا گیا اور کسی ایک فرد کے خلاف بھی کوئی جابرانہ کارروائی کی گئی؟ پھر ایمرجنسی کے حالات سے فائدہ اٹھانے کا حق حضرت ابوبکرؓ کو تھا جب کہ وہ نبی صلعم کے وصال کے فوراً بعد نبوت کے مدعیانِ کاذب اور مانعین زکوٰۃ کے فتنے میں ریاست کو مبتلا دیکھ رہے تھے۔ پھر یہ حق حضرت عثمانؓ کو حاصل ہو سکتا تھا جن کے دَور میں اشرار نے ساری فضا کو فتنہ زدگی میں مبتلا کر دیا۔ پھر یہ حق حضرت علیؓ

تاہم یہاں اس سوال کو درکنار رکھ کر ہم جس حقیقت کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہنگامی حالات کے نام پر قانون سازی کی دو نوعیتیں ہو سکتی ہیں :-

ایک یہ کہ واقعی ہنگامی صورت حالات نمودار ہو اور اس کے تحت کوئی حکومت ہنگامی ضرورت کے قوانین بنائے دوسری یہ کہ مستبدانہ اختیارات حاصل کرنے کے لئے خواہ مخواہ ہنگامی صورت حالات کا موجود ہونا فرض کیا جائے یا اسے الٹے سیدھے دلائل سے ثابت کیا جائے ۔

ہنگامی صورت حالات یا ایمرجنسی کے معنی اگر یہ ہیں کہ ایک ملک کو کسی نہ کسی دوسرے ملک سے شدید اختلافات ہیں یا وہ تعمیر و ترقی کے مراحل سے گزر رہا ہے، یا وہ کچھ نہ کچھ مخالفانہ طاقتوں سے خطرے کے امکانات کا احساس رکھتا ہے تو یہ چیزیں تو آزادی کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں، اور ایمرجنسی کا اطلاق اگر انہی چیزوں پر ہوتا ہے تو دنیا کا ہر آزاد ملک ہر آن ایمرجنسی ہی کی حالت میں مبتلا رہتا ہے ۔

چنانچہ ہمارے ہاں بھی ایمرجنسی اسی نوعیت کی ہے اور یہ ایمرجنسی اس بری طرح ہمارے قانون گروں کے دل و دماغ پر پرتو ڈالے ہوئے ہے کہ ان کے جس ایکٹ اور جس فرمان کو آپ اٹھا کر دیکھیں گے اس کے ابتدائیے ( Preamble ) میں ایمرجنسی کا حوالہ ضرور ملے گا ۔

"پروڈا" کی بسم اللہ بھی "ایمرجنسی" کے تذکرے سے ہوئی ہے ۔

آپ فرما سکتے ہیں کہ جب پروڈا بنا تھا تو اس وقت کشمیر کے لئے جہاد ہو رہا تھا اور پنجاب جو اس جہاد کی پشت پناہی کرنے والا تھا اس کے نظم و نسق میں فساد برپا تھا۔ اسی ایمرجنسی نے حکومت کو مجبور کیا کہ وہ سخت قدم اٹھائے۔ اس دعوے کو ہم یقیناً صحیح تسلیم کر لیتے، لیکن صرف اس صورت میں جب کہ ایک خاص ہنگامی حالت کے گذر جانے کے پہلے ہی لمحے بعد پروڈا کو واپس لے لیا جاتا۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ آج "جہاد کشمیر" نہیں ہو رہا ہے مگر پروڈا بدستور موجود ہے ۔

---

بقیہ حاشیہ صفحہ : - کو ملنا چاہیے تھا کہ جن کے دور میں فساد کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا مگر کیا کوئی نظیر ان خلفائے راشدین کے دور سے ایمرجنسی کے نام پر مستبدانہ اختیارات حاصل کرنے کی ملتی ہے ؟

پھر آپ کا یہ فرمانا بھی بجا ہوگا کہ ایمرجنسی کا اطلاق حالات کے شدید مطالبوں اور تقاضوں پر بھی تو ہوتا ہے۔ جب خیانت کاری حکومت کے اونچے ایوانوں میں جلوہ گر ہو جائے تو یہ چیز خود ایک بڑی ایمرجنسی پیدا کر دیتی ہے۔ اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیئے غیر معمولی اختیارات اور غیر معمولی تدابیر کو کام میں لانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انگریزی دور میں بھی ایڈمنسٹریشن کو خیانت سے بچانے کے لئے کچھ انتظامات موجود تھے، ان کو آپ ناقص اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ اُس دور میں آج کی بہ نسبت نظم و نسق کی حالت بہتر تھی۔ لیکن خیر وہ ناقص سہی، تو بھی ان کے نقص کی اصلاح کرنے کے لئے یہ کیوں ضروری ہوا کہ مستبدانہ اختیارات سے کام لیا جائے۔ کیوں نہ ایسا ہوا کہ تعزیرات پاکستان میں رشوت ستانی وغیرہ کی روک تھام کے لیے پہلے سے جو قانون موجود تھا اس کی کوتاہیاں دور کر کے اسے ایک مکمل طاقت بنا دیا جاتا؟ ساری کارروائی ضابطۂ تعزیرات کے تحت باقاعدگی سے عمل میں آتی اور عدالتوں کے ہاتھ باندھے نہ جاتے۔

ایک وسیع الاثر مفسدے کو روکنے کے لیے قانون و عدالت کا وہ سیدھا راستہ اختیار کرنے کے بجائے جب راستہ مستبدانہ اختیارات کا پسند کیا گیا ہے تو معاملہ تجزیہ طلب ہو جاتا ہے۔ اور خود لفظ "ایمرجنسی" کا حقیقی مفہوم متعین کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

جن لوگوں کے ذہن پر سال کے بارہ مہینے، مہینے کے تیس دن اور دن کے چوبیس گھنٹے ایمرجنسی کا احساس مسلّط رہتا ہو، ضروری ہے کہ ان کے ذہن کو آپ خوب اچھی طرح سمجھ لیں "خطرے کی حالت" اور "نازک صورتِ حالات" اور "ہنگامی حالات" ایسی چیز نہیں ہے کہ جسے ملک کے عوام محسوس نہ کرتے ہوں اور صرف چند "بادہ فروشوں" (در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید!) پر منکشف ہو۔ "خطرہ" اور "ہنگامی حالات" اور "ایمرجنسی" جب آتی ہے تو سارے ملک کی فضا بدل جاتی ہے، اس کی ایک عام حس پیدا ہو جاتی ہے، اس کی بُو ہر طرف پھیل جاتی ہے لیکن جہاں یہ بُو صرف چند گنے چُنے افراد کو ہی محسوس ہوتی ہو وہاں یہ سوچنا لازم ہو جاتا ہے کہ کہیں فساد خود ان "ناکوں" ہی میں تو نہیں ہے!

یاد رکھیئے کہ اگر ملک کی عام فضا ایمرجنسی کا احساس نہ رکھتی ہو بلکہ صرف چند "پیرانِ طریقت" ہی کو "مراقبوں" میں اس کا "مشاہدہ" حاصل ہوتا ہو تو پھر وہ ایمرجنسی ملک اور جمہورِ قوم کے لئے نہیں ہوگی، "ایمرجنسی" ہوگی ہی ان

"پیرانِ طریقت" کے لئے ! مشہور اصول ہے کہ "آپ ڈوبے تو جہاں ڈوبا" اسی اصول کے تحت جب چند نادر روزگار ہستیوں کو اپنی دنیائے اقتدار خطرے میں گھری ہوئی محسوس ہوتی ہے تو وہ ساری دنیا کو خطرے کی حالت میں مبتلا پاتے ہیں۔ ایمرجنسی کی یہی نوعیت ہے جس کا احساس ہماری قانون سازی کی رگوں میں سرایت کر گیا ہے۔

**اصل ایمرجنسی** پروڈا کے نفاذ کے وقت اصل ایمرجنسی کیا تھی جو اس قانون کی تدوین کی محرک ہوئی؟ اس راز کو کھولا نہیں گیا، مگر حالات کا پس منظر خود اسے کھولے دے رہا ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ وہ فوقیت یافتہ گروہ جسے انگریز اپنا جانشین بنا کر گیا تھا، کوئی ایسا گروہ نہ تھا جسے کسی پاکیزہ نصب العین کی مخلصانہ وفاداری نے جمع کر کے ایک بنیان مرصوص بنایا ہوتا، بلکہ وہ سراسر مفاد پرست عناصر پر مشتمل تھا جنہیں اپنے مفاد کی وفاداری نے اس گروہ میں لا کر شامل کر دیا تھا پاکستان بننے کے تھوڑی ہی مدت بعد جب غیر متوقع کامیابی کے اچانک صدمے سے ان عناصر کو ذرا افاقہ ہوا اور ان کے حواس برجا ہونے شروع ہوئے، تو ان کے اندر دو قسم کے رجحانات ابھرتے نظر آئے:

ایک یہ کہ اُن کے ذرا زیادہ حوصلہ مند افراد نے، جو اپنے حوصلوں کے مطابق پوزیشن نہ پا سکے تھے، عالم بالا کی طرف دیکھنا شروع کر دیا اور مرکزی اقتدار کو انہیں "ایاز قدر خود بشناس" کا سبق دینے کی ضرورت پیش آئی۔

دوسرے یہ کہ ان میں سے بعض لوگوں نے پاکستان سازی کے لیے اپنی "خدمات" کا اتنا زیادہ اجر مانگنا، بلکہ لینا شروع کر دیا جس سے پورے طبقے کی ساکھ بگڑ جانے کا سخت اندیشہ پیدا ہو گیا۔ اور چونکہ اس مسئلے کا اصل قابلِ لحاظ پہلو یہ نہ تھا کہ پبلک سے کتنا اجر لینا اور کس طرح لینا جائز و معقول ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ اس کا فیصلہ کرنا عدالتوں کا کام نہ تھا۔ جو چیز قابل لحاظ تھی وہ صرف فوقیت یافتہ طبقے کی ساکھ تھی، اور اس کے بارے میں اس طبقے کے سربراہ کار ہی بہتر جج بن سکتے تھے کہ کتنا اور کس طرح لینا اِس ساکھ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔

یہ تھی اصل ایمرجنسی۔ اب دیکھیے کہ اس کا کس شان سے پروڈا میں مقابلہ کیا گیا۔

پروڈا کی زد

۶- جنوری ۱۹۴۹ء کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں ترمیم کرتے ہوئے دستور یہ پاکستان نے پروڈا کو جس شکل میں پاس کیا تھا اس کا دیباچہ یہ تھا :-

"چونکہ ایسے اشخاص کو، جو کسی ذمہ دارانہ پبلک عہدے یا کسی نمائندگی کے منصب یا ان سے متعلقہ کسی معاملے میں عدالتی تحقیقات سے بدکرداری کے مجرم پائے جائیں مناسب مدت کے لیے سیاست بدر کرنے کا دقانونی، انتظام کرنا لابدی ہے، لہٰذا اس مقصد کے لیے حسب ذیل قانون بندی کی گئی ہے : ــــ"

معلوم ہوا کہ قانون کچھ خاص قسم کے لوگوں کے لیے ہے۔ ان مخصوص لوگوں کی فہرست اسی ایکٹ کی دفعہ ۳ کے تحت بیان کر دی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو :-

(۱) وزراء بشمول وزرائے اعظم (۲) نائب وزرا، (۳) مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے پارلیمنٹری سیکرٹری (۴) مجلس دستور ساز، مجلس قانون ساز مرکزی اور مجالس قانون ساز صوبائی کے ارکان۔

یعنی اس قانون کا دائرۂ عمل بالخصوص حکمران گروہ کو محیط ہے۔ اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس گروہ کے افراد اپنے اختیارات کو غلط استعمال کر کے جو چھوٹے سے چھوٹا بھی جرم کریں وہ عام شہریوں کے بڑے سے بڑے جرائم سے زیادہ مفسدہ انگیز اور فتنہ خیز ہو سکتا ہے۔ ان کی غلط کاریوں اور بدکرداریوں کی لپیٹ میں پوری قوم کا دینی اور دنیوی مفاد آجاتا ہے۔ لہٰذا ان کے جرائم کی شدت اور وسعت کا لحاظ کرتے ہوئے اگر کوئی مستقل قانون بنایا جائے تو ایسا کرنا مناسب ہی ہوگا!

مگر آگے کی دفعات بتاتی ہیں کہ اکابر کے لیے جداگانہ قانون سازی کا منشا یہ نہیں ہے کہ ان کو ان کے جرائم کی کما حقہٗ سزا دی جا سکے، بلکہ یہ جداگانہ قانون سازی اس لیے کی گئی ہے کہ طبقۂ بالائی کو عام شہریوں کی طرح عدالت کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دیا جائے بلکہ اس کے مجرم افراد پر مقدمہ چلانے اور سزا دینے کے اختیارات براہ راست مرکزی حکمراں طاقت کے ہاتھ میں رہیں۔

بصورتِ دیگر اگر یہ قانون عام نظام عدالت سے ہم آہنگ ہو کر کام کرنے والا ہوتا تو آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ امرائے قوم میں سے شاذ ہی کسی کی پیٹھ ہوتی جو اس کوڑے سے بچ سکتی۔ چنانچہ کوڑا عدالت کے

ہاتھ میں نہیں گورنر جنرل کے ہاتھ میں دیا گیا ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ پروڈا کے دائرہ میں وہ لوگ باقی رہ جائیں جو مرکز سے سرکشی کرتے ہوں۔ رہے مرکز کے وفادار، تو وہ اس سے بالاتر ہیں۔

آپ پروڈا کے استعمال کی تاریخ کو دیکھ کر خود رائے قائم فرما لیجیے کہ امرِ واقعہ یہی ہے یا کچھ اور!

پروڈا اگر عدالت کا ہتھیار ہوتا تو پنجاب اور سرحد اور بہاولپور کے اُن تمام اکابر پر مقدمے چل جاتے جنھوں نے انتخابات میں کھلم کھلا اپنے اختیارات کو ناجائز طریقوں سے استعمال کیا ہے، بلکہ شاید مرکزی اکابر بھی نہ بچ سکتے! اور پروڈا اگر اختیارات کے ناجائز استعمال پر بے لاگ طریق سے گرفت کرنے والا قانون ہوتا تو کچھ بعید نہ تھا کہ اُس وزیر کے خلاف بھی وہ حرکت میں آجاتا جس نے اپنے بچے کی خاطر لاہور چھاؤنی پر اپنی وزارت کے زور سے میل ٹرین روکی تھی۔

**فوق الفوق اختیار** پروڈا چونکہ اقتدار کا ہتھیار ہے، اس لیے حسبِ معمول پروڈا کے استعمال میں اقتدار نے اپنے آپ کو عدالت سے بالاتر رکھا ہے۔ ایک معقول عدالتی نظام وہی ہو سکتا ہے جس کا دروازہ چاہے تو کوئی شہری کھٹکھٹائے اور چاہے حکومت کی طرف سے پولیس دستک دے، وہ دادرسی کے لیے فوراً اپنے کواڑ کھول دے —— وہ استغاثہ سُنے، وہ اس پر تحقیقاتی کارروائی مکمل کرے، وہ اپنا قانونی فیصلہ دے اور وہ فیصلہ نافذ ہو۔ لیکن اگر کوئی طاقت بیچ میں آ دخل انداز ہو، وہ چاہے تو استغاثہ پیش ہو سکے اور نہ چاہے تو نہ ہو سکے، وہ ضرورت سمجھے تو عدالت کو تحقیقاتی کارروائی مکمل کرنے کا حکم دے اور ضرورت نہ سمجھے تو عدالت کو اس سے روک دے، اور پھر اسی کی رضا ہو تو فیصلہ ایک قانونی و عدالتی فیصلے کی طرح نافذ ہو، ورنہ نہ ہو، تو ایسی صورت میں عدالتی نظام کے ہاتھ بندھ جانے کی وجہ سے انصاف کی طاقت ایڈمنسٹریشن کی محض آلۂ کار بن کر رہ جاتی ہے۔ جس معاملے میں بھی ایڈمنسٹریشن قانون و عدالت کے مقابلے میں اس طرح کی دخل اندازی کے لیے فوق الفوق اختیارات حاصل کرے اس معاملے میں قانون فیصلہ کن چیز نہیں ہوتا بلکہ فیصلہ قانون کے آقاؤں کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے۔ فوق الفوق اختیارات کے معنی یہ ہیں کہ اب حکم ترازو کے تول پر نہیں لگایا جائے گا بلکہ اس بنیے کی مرضی کے تحت لگایا جائے گا جس کے ہاتھ میں ترازو ہے اور جسے اختیار حاصل ہے کہ وہ باٹوں کے فیصلے کو بالکل رد کر کے اپنا

فیصلہ دے۔ وہ کم وزن کو زیادہ اور زیادہ کو کم قرار دے دے تو ترازو اور باٹ اور گاہک اور مشتری سب بے بس ہوں گے۔ فوق الفوق اختیارات رکھنے والے صرّاف کے ہاں کھرے اور کھوٹے کا امتیاز کسوٹیاں نہیں کیا کرتیں بلکہ کسوٹیوں کو صرّاف کی مرضی کے مطابق کھوٹے کو کھرا اور کھرے کو کھوٹا بنانا پڑتا ہے۔

پروڈا اور اس کے متعلقہ قواعد کی رُو سے گورنر جنرل اور صوبائی گورنروں کو نظامِ عدالت کے مقابلے میں پورے پورے فوق الفوق اختیارات سے مسلح کر دیا گیا ہے۔ گورنر جنرل یا صوبائی گورنر ہی یا تو بطور خود یا کسی شہری کی درخواست پر (جس پر کم از کم پانچ افراد کے دستخط ہونے ضروری ہیں) ابتدائی تحقیقات کے بعد یہ حکم دینے والا ہے کہ معاملہ عدالت (فیڈرل کورٹ، ہائی کورٹ یا اسپیشل ٹریبونل) کے سامنے جانا چاہیے۔ وہ اگر ایسا حکم نہ دے تو پروڈا کے تحت کسی مجرم سے نظامِ عدالت کوئی باز پرس کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ پھر عدالت بعد تحقیق جو بھی رائے قائم کرے (اور قانوناً چاہے اس کا فیصلہ کچھ بھی ہو سکتا ہو) وہ باختیارِ خود کسی خیانت کار عہدے دار کو سیاست بدر کرنے یا کوئی دوسری سزا دینے پر قادر نہیں ہے بلکہ وہ صرف گورنر جنرل یا گورنر کے سامنے بصیغۂ راز اپنی رپورٹ پیش کر کے اپنا کام ختم کر دے گی۔ اس کے بعد آخری فیصلہ اور اس کا نفاذ کرنا بھی گورنر جنرل یا کسی صوبائی گورنر کا کام ہوگا جس کی طرف سے ابتداءً عدالتی کارروائی کی تحریک کی گئی تھی!

۹- جولائی ۱۹۴۹ء کے قواعد ( Rules ) متعلقہ پروڈا کی دفعہ ۶ میں "کارروائی آغاز" کے عنوان سے یہ طے کیا گیا تھا کہ پروڈا کی دفعہ ۳ کی رُو سے گورنر جنرل یا صوبائی گورنر اپنے حکم سے عدلیہ (فیڈرل کورٹ یا ہائی کورٹ) کو حرکت میں لائے گا، یا اسپیشل ٹریبونل کی تقرری عمل میں لائے گا — یہ "کارروائی آغاز" جب تک گورنر جنرل یا صوبائی گورنر کی طرف سے عمل میں نہ آئے عدلیہ کسی خیانت کار عہدے دار کا معاملہ ہاتھ میں نہیں لے سکتی۔ اور نہ پروڈا کے تحت کوئی عدالتی کارروائی اس کے خلاف کر سکتی ہے۔

بعد میں ۹ جولائی ۱۹۴۹ء کے قواعد کو منسوخ کر کے ۲۷ جون ۱۹۵۰ء کو جو نئے قواعد نافذ کیے گئے ان میں پھر پروڈا کی "کارروائی آغاز" کے لیے فرمانِ تحقیقات ( Referring Order )

کو اصل کلیہ کار قرار دیا گیا ہے، اور اس کام کے لیے گورنر جنرل یا صوبائی گورنر کو مختارِ تفویض (Referring Authority) ٹھیرایا گیا۔ یعنی ریفرنگ اتھارٹی اپنے فرمانِ تحقیقات سے عدلیہ کو حرکت میں لائے تو وہ حرکت میں آجائے گا ورنہ لائے تو براہ راست اس کے اپنے پاس کوئی اختیارات پروڈا کے تقاضے پورے کرنے کے لیے نہیں ہیں۔ ان قواعد کی دفعہ ۱۴ واضح کرتی ہے کہ فرمانِ تحقیقات صادر ہونے کے معنی یہ ہونگے کہ کسی عہدہ دار پر الزام عاید کیا گیا ہے۔ اس کے بغیر قانون کی رُو سے کوئی الزام الزام کی حیثیت ہی نہیں رکھتا۔

پھر یہ ریفرنگ اتھارٹی اپنی طرف سے اگر کسی خیانت کار عہدے دار کے خلاف کارروائی کرنا چاہے تو بلا کسی روک ٹوک کے کرسکتی ہے، لیکن جب شہریوں کی طرف سے سلسلہ جُنبانی کی جائے تو قطع نظر دوسری سخت پابندیوں کے (جن کا تذکرہ ہم آگے کر رہے ہیں)، ریفرنگ اتھارٹی، ۲۰ جون ۱۹۵۰ء کے آخری قواعد کی دفعہ ۹ کے مطابق شہریوں کی درخواست کو اس بنا پر رد کرسکتی ہے کہ الزامات کے لیے وجوہ و دلائل ناکافی ہیں۔

کسی درخواست کو رد یا قبول کرنے سے پہلے انہی قواعد کی دفعہ ۷ کے رُو سے ریفرنگ اتھارٹی الزامات اور دلائل و شواہد کی ابتدائی تحقیقات کے لیے اپنی طرف سے قابلِ اطمینان انتظام کرے گی۔ یہ ابتدائی تحقیقاتی کارروائی معاملہ کے عدلیہ کے سامنے جانے سے پہلے انتظامیہ (Executive) کی طرف سے عمل میں آئے گی، کیوں کہ عدلیہ سے بالا بالا ریفرنگ اتھارٹی کو پہلے یہ طے کرنا ہے کہ درخواست عدالتی کارروائی کے لیے موزوں بھی ہے یا نہیں؟

ابتدائی تحقیقاتی کارروائی کی تکمیل پر اگر ریفرنگ اتھارٹی الزامات اور ان کے دلائل و شواہد پر مطمئن نہ ہو تو وہ درخواست کو رد (Dismiss) کر دے گی۔ درخواست کی یہ "مردودی" بہرحال میں قانوناً جائز قرار پائے گی۔ اور اس سلسلہ میں ریفرنگ اتھارٹی پر ایسی کوئی ذمہ داری نہ ہوگی کہ جس پبلک کے نمائندے پر خود اسی پبلک کے مفاد کے خلاف کچھ کام کرنے کے الزامات تھے، اس کو بھی وہ درخواست کو رد کر دینے کے وجوہ سے مطلع کرے۔

۲۷ جون ۱۹۴۹ء کے قواعد کی دفعہ ۱۶ میں طے کیا گیا ہے کہ عدالتی تحقیقات کی تکمیل پر عدالت یا ٹریبونل ریفرنگ اتھارٹی کے سامنے اس امر کی رپورٹ پیش کرے گا کہ ملزم کے خلاف بدکرداری کے الزامات پایہ ثبوت کو پہنچ سکے ہیں یا نہیں۔ یہ رپورٹ اور پوری مسل کارروائی اٹھا کر ریفرنگ اتھارٹی کے سامنے رکھ دی جائے گی۔ یعنی ملک کی انتہائی اونچی عدالتیں اور خاص قابلِ اعتماد افراد پر مشتمل ٹریبونل بھی اس امر کے مجاز نہیں ہیں کہ وہ قانون کے فیصلے کو نافذ کر دیں، بلکہ ان کا کام رپورٹ پیش کر دینے پر ختم ہو جاتا ہے اور فیصلہ "ترازو کے بجائے" پنجے" کے اختیاراتِ خصوصی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

یہ قواعد ریفرنگ اتھارٹی کے فوق الفوق اختیارات کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں، مگر اس "ختمِ مئے اختیار" کے سر پر جو مہر لگائی گئی ہے وہ اور بھی بالاتری پیدا کرتی ہے۔ اصل پروڈا کی دفعہ ۹ کہتی ہے کہ:۔

"دفعہ ۳ کے تحت گورنر جنرل کی طرف سے جاری ہونے والا کوئی بھی حکم (وہی فرمانِ تحقیقات) بالکل قطعی ہوگا اور اسے کسی بھی عدالت میں (زیرِ بحث لانے کے لیے) طلب نہ کیا جاسکے گا"

اس دفعہ کی رُو سے انصاف گورنر جنرل کے مقابلے میں بالکل بے دست و پا ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ دفعہ درحقیقت اوپر کے بیان کردہ فوق الفوق اختیارات کی تکمیل کرتی ہے:

ان فوق الفوق اختیارات کے جواز کی وکالت کرتے ہوئے ایک صاحب نے پارلیمنٹ میں بڑا مزے کا استدلال کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ چونکہ پروڈا کے تحت سرکاری عہدے داروں سے ایک بنیادی شہری حق کے سلب ہونے کا نازک معاملہ سامنے ہوتا ہے اس لیے پورے ملک کے ولی و سرپرست کی منظوری کے بغیر یہ کارروائی کر دینا اور اتنے بڑے معاملے کو محض عدالتوں کی تحویل میں چھوڑ دینا نامناسب ہوگا لیکن یہ وکیل صاحب اپنی اس دلیل کو سامنے رکھ کر کیا غور نہ فرمائیں گے کہ عدالتیں جتنے بھی مجرمین کو کوئی سزا دیتی ہیں تو بہرحال ان کے کسی نہ کسی شہری حق پر ہی ہاتھ ڈالتی ہیں۔ مثلاً کسی کو پھانسی چڑھانے کے معنی یہ ہیں کہ اس سے زندگی کا حق جو دوسرے تمام بنیادی حقوق سے مقدم حق ہے، سلب کر لیا گیا۔ کسی کو قید میں ڈالنے کے معنی یہ ہیں کہ اس سے آزادی کا حق جو پبلک لائف میں شرکت کرنے کے حق سے فائق تر ہے ایک خاص مدت کے لیے چھین لیا گیا۔ کسی پر جرمانے یا ضبطی جائداد کا حکم نافذ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس

کے حقِ ملکیت پر ہاتھ ڈالا گیا۔ علی ہذا القیاس کسی کو تازیانے لگانے کے معنی یہ ہیں کہ اس سے حفاظتِ جسم کا حق واپس لے لیا گیا۔ پھر کیوں نہ ان سارے حقوقِ شہریت میں عدالتوں کو تصرف کرنے سے روک کر ہر معاملہ گورنر جنرل کے "ریفرنگ آرڈر" اور اختیارِ تمیزی پر منحصر قرار دے دیا جائے اور ہر عدالت کا کام صرف یہ نہ رہ جائے کہ وہ "رپورٹ" کر دیا کرے؟

حیرت ہوتی ہے کہ ایک ملک کا انتظام چلانے والے دماغ کیسے کیسے نکتے اور کیسے کیسے اسرار و رموز بیان فرماتے رہتے ہیں، اور وہ بھی پرائیویٹ صحبتوں میں نہیں، بلکہ ملک کی پارلیمنٹ میں، جہاں کے بولے ہوئے الفاظ ساری دنیا کے پردہ ہائے گوش سے ٹکراتے ہیں۔ ایسی باتوں سے ملک کی ذہنی ساکھ کیا برباد نہ ہو جائے گی؟

**جرم اور تعزیرِ جرم میں عدم توازن**

پروڈا سرکاری عہدے داروں اور نمائندگیِ عوام کے مناصب پر کام کرنے والوں کی "بدکرداری" (Misoonduet) سے نمٹنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ بدکرداری کی قانونی تعریف میں اصل پروڈا کی دفعہ ۳ کے رُو سے حسب ذیل جرائم کو شامل کیا گیا ہے:

(۱) رشوت ستانی (۲) بد معاملگی (۳) خیانت کاری (۴) کنبہ پروری (۵) دوستوں عزیزوں کے ساتھ بے جا جنبہ داری (۶) بالارادہ بدنظمی (۷) مرکزی حکومت یا صوبائی حکومتوں کے تنخواہ دارانہ یا آنریری عہدوں پر کام کرنے والوں کی طرف سے پبلک کی رقوم اور پبلک کے جمع کردہ چندوں کا بے جا استعمال (۸) کسی دوسری صورت میں سرکاری اختیارات اور اثر و رسوخ سے ناجائز استفادہ کرنا یا ناجائز استفادہ کرنے میں کسی طرح کی اعانت کرنا!

"بدکرداری" کی یہ تفصیل سامنے رکھ کر ذرا غور فرمائیے کہ اس کے تحت آنے والے کسی ایک جرم کا قومی زندگی پر کتنا دور رس اثر پڑ سکتا ہے۔ رشوت ستانی اگر پٹواری اور چنگی کا محرر اور ریلوے کا گڈس کلرک بھی کرے تو انتہائی حد تک قابل نفرت ہے، مگر جب کسی وزیر اور کسی ڈپٹی کمشنر اور کسی ڈائرکٹر اور کسی پارلیمنٹری سیکرٹری کو اس کی چاٹ پڑ جائے تو پھر وہ تنہا درجنوں پٹواریوں اور سینکڑوں چنگی کے محرروں اور ہزار ہا گڈس کلرکوں کے برابر تباہی پھیلائے گا۔ وہ ہاتھ کہ جس کی تحویل میں قوم نے اپنی بڑی بڑی امانتیں سونپی ہوں،

اگر خود ہی حفاظت کا ہاتھ ہونے کے بجائے خیانت کا ہاتھ بن جائے تو اس کی مار سے کس کے لیے پناہ ہوگی؟
اگر ایک قوم کے اونچے درجے کے کار پرداز کنبہ پروری اور جنبہ داری پر اتر آئیں تو پھر انصاف اور احترام
حقوق کا حال کیا ہوگا؟ اگر پبلک کی رقوم اور چندے قوم کے امینوں کے ہاتھ میں غیر محفوظ ہو جائیں تو پھر
اجتماعی زندگی کا کونسا گوشہ ہے کہ جو متاثر نہ ہوگا؟ راعی جب خود ہی بھیڑ بکریوں کے لیے بھیڑیا بن جائے
اور باڑھ جب خود ہی فصل چرنے لگے تو امن کس منڈی سے خرید کر لایا جا سکتا ہے؟ کوتوال شہر ہی جب
آلاتِ نقب زنی لیے چوری کی مہم چلا دے تو اس کی دست برد سے کون بچ سکے گا؟

کسی قوم کے ذمہ دار لوگوں کی بدکرداری کے معنی ایک طرف اگر یہ ہیں کہ گویا اس کی قوت کو دیمک اور سیل
لگ گئی ہے تو دوسری طرف اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ پوری قوم کے لیے بڑے لوگ بدکرداری کے معلم ہیں!
اس لیے عقل گواہی دیتی ہے اور انصاف تقاضا کرتا ہے کہ عام لوگوں کی بدکرداری اور بڑے لوگوں کی
بدکرداری میں زمین و آسمان کا جو فرق ہے اس کے پیشِ نظر بڑے لوگوں کو بہت ہی بھاری سزا ملنی چاہیے۔
لیکن "پروڈا" کے واضعین نے عقل و انصاف کے اس تقاضے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ان
کی میزانِ انصاف بالکل ہی الٹا تول تولتی ہے۔ یعنی معمولی ملازمِ سرکار اگر مذکورہ بالا جرائم میں سے اپنے
اختیارات کے مطابق ایک چھوٹے سے دائرہ میں بدکرداری دکھائے تو عدالت میں اس پر مقدمہ چلایا
جائے گا اور عدالت کے سامنے وہ بدکرداری ثابت ہو جائے تو اسے جیل بھیجا جائے گا۔ لیکن اگر حکمراں
طبقے میں سے کوئی اپنے اختیارات کے وسیع دائرے کے مطابق کسی بڑے سے بڑے پیمانے پر وہی جرم
کرتا ہے تو گورنر یا گورنر جنرل سے فریاد کی جائے گی، وہ مناسب سمجھے تو عدالت سے تحقیقات کرائے گا،
اور عدالت میں جرم ثابت ہو جائے تو اس کو بڑی سے بڑی سزا یہ دی جائے گی کہ اسے دس سال کے لیے
حکمراں طبقے میں شمولیت سے محروم کر دیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی خیانت کاریوں سے اتنا کما چکا
ہو کہ عہدوں کی دنیا سے ہجرت کر کے وہ کاروبار یا زمینداری یا صنعت کی دنیا میں اپنی دنیا آپ پیدا کر
لے یا لیڈری کے میدان کا شہسوار بن جائے۔ لیکن فرض کیجیے کہ ایسا نہ بھی ہو تو نمائندہ مناصب سے
کسی کا الگ کیا جانا اس کے جرائم بدکرداری کی کوئی معقول سزا کیسے قرار پائے گا؟ اگر یہ بھی کوئی معقول

سزا ہے تو اسی معقول سزا کے اصول پر قانون کو ہر معاملے میں یہی کرنا چاہیے۔ جب کوئی شخص کسی امانت میں خیانت کرے تو بس آئندہ سے اسے امین بنانا چھوڑ دیا جائے، یا جب کوئی پولیس کانسٹیبل یا فوج کا سپاہی سرکاری رائفل سے اپنی ذاتی مخاصمتوں کے تحت کئی جانوں کا قتل کر دے تو اُسے پھانسی دینے کے بجائے یہ سزا دے دی جائے کہ دس سال تک وہ رائفل رکھنے سے محروم رہے گا!

کسی معقول اور مبنی بر انصاف نظامِ قانون کی ایک لازمی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ جرم اور تعزیرِ جرم کو متوازن (Proportionate) بنائے۔ ورنہ اگر خطا و سزا میں توازن و تناسب نہیں ہوگا تو انصاف کے تقاضے کبھی پورے نہ ہوسکیں گے۔ اس عقلی معیار پر جب ہم پروڈا کو پرکھتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ خطا و سزا کے پلڑے برابر نہیں ہیں۔ جرم اور تعزیرِ جرم میں سرے سے کوئی تناسب و توازن نہیں ہے۔ خطا اگر من بھر کی ہے تو سزا پانچ تولے سے زیادہ نہیں۔ جرم اگر ایکڑ بھر کا ہے تو تعزیرِ جرم دو چار مربع انچ سے آگے نہیں جاتی۔ ہماری عقل حیران ہے کہ آیا یہ قانون سازی واقعی کچھ ایسے انسانوں نے کی ہے جن کے سروں میں کم سے کم عقلِ عام (Commonsense) تو سلامت تھی!

۲۳ جولائی ۱۹۵۱ء کو گزٹ آف پاکستان میں پروڈا میں ترمیم کرنے کے لیے جو آرڈی ننس شائع ہوا ہے اس کی دفعہ ۲ کو پیش کر کے کہا جاتا ہے کہ دیکھیے اس دفعہ کی رُو سے پروڈا کی دی ہوئی سزا کسی دوسرے قانون کے تحت دی جا سکنے والی سزا کا راستہ روک نہیں سکتی بلکہ پروڈا تو معمولی سزا کے اوپر مزید اضافہ کرنے کے لیے ہے۔ لیکن درحقیقت یہ محض ایک فریب ہے۔ ملک میں کوئی ایسا قانون موجود ہی نہیں ہے جس کے تحت نمائندہ عہدہ داروں کی بدکرداری کو جرم قرار دیا گیا ہو، نہ ضابطہ فوجداری میں اس کی کوئی تصریح ہے کہ ان کے خلاف کس دفعہ کے تحت پبلک استغاثہ کرے گی یا حکومت مقدمہ چلائیگی۔ وزراء آج اس مقام پر بیٹھے ہیں جہاں کبھی وائسرائے اور گورنروں کے اگزیکیٹو کونسلر بیٹھا کرتے تھے۔ اور انگریز کا منشا یہ تھا کہ یہ پورا ملاء اعلیٰ قانون سے بالاتر ہوکر رہے۔ اس لیے اس نے تعزیراتِ ہند اور ضابطہ فوجداری میں اُن جرائم کا کوئی ذکر تک نہ کیا جن کا ارتکاب یہ لوگ بہ حیثیت عہدہ کریں۔ اب اسی خلاء سے ہماری قومی حکومت کے منتظمین فائدہ اٹھا رہے ہیں، اور انہوں نے پروڈا صرف اس لیے بنایا ہے کہ

اُن کے گروہ کے لوگ کبھی خود ان کے مقابلے میں سر نہ اٹھا سکیں۔ مگر وہ یہ کہہ کر ہمیں دھوکا دینا چاہتے ہیں کہ پروڈا کی سزا کسی دوسرے قانون کے تحت دی جا سکنے والی سزا میں مانع نہیں ہے۔ کیا وہ ہمیں بتائیں گے کہ وہ دوسرا قانون ہے کونسا جس کے تحت انہیں سزا دی جا سکتی ہو؟

پس واقعہ یہی ہے کہ وزراء اور دوسرے نمائندہ عہدہ داروں کے لیے بدکرداری کی سزا اگر کوئی ہے تو بس وہی جو پروڈا میں تجویز کر دی گئی ہے۔ جرم اور تعزیرِ جرم کا یہ عدم تناسب جو آپ دیکھتے ہیں، یہ بھی سوسائٹی پر ایک فوقیت یافتہ طبقے کی موجودگی کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس فوقیت یافتہ طبقے، اور پھر اس کے مٹھی بھر افراد کے حکمران گروہ کی ذہنی ساخت ہی ایسی ہے کہ وہ جب کوئی ایسی چیز سوچے تو عام لوگوں سے اپنے آپ کو الگ کر کے اپنے گروہ کے ساتھیوں کے ساتھ جانبداری کا رویہ اختیار کرے۔ ہمارے ملک کی حکمراں طاقت کارپردازانِ حکومت کی کنبہ پروری و جانبداری کے خلاف تو پروڈا کے تحت کچھ کارروائی کر سکتی ہے، لیکن قانون سازی کے پس منظر میں خود اسکی ذہنیت جس مستقل جانبداری کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے، اس کے لیے کوئی پروڈا موجود نہیں ہے!

**قانونی مساوات کا خاتمہ** ہم تمہیدی سطور میں ایک معقول قانون کی تعریف کرتے ہوئے اس کی لازمی خصوصیات میں سے ایک یہ خصوصیت بھی بیان کر چکے ہیں کہ اس کے بنیادی اصولوں میں مساوات کا اصول شامل ہونا چاہیے۔ قانون کی ترازو قابلِ اعتماد اُسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کہ وہ سب کے لیے ایک ہی تول تولے اور اس کے پلڑے اور باٹ دوسروں کے لیے بھی وہی ہوں جو خود ترازو والے کے لیے ہوں۔ واقیموا الوزن بالقسط و لا تخسروا المیزان! جس قانونی نظام میں اس اصول کے بخلاف کوئی جھول اور سلوٹ موجود ہو اور وہ مختلف لوگوں سے مختلف سلوک کرے، یا اکابر و اصاغر میں اور حاکم و محکوم میں کوئی امتیاز روا رکھے تو پھر اس کو قانونی نظام نہیں کہنا چاہیے، اس کا نام اندھیر گردی رکھنا چاہیے۔ دنیا میں اندھیر گردی کی بدترین شکل یہی ہے کہ اندھیر گردی قانون کا مقدس لباس پہن لے اور "سکھا شاہی" نظامِ عدالت کے سانچے میں ڈھل جائے۔ انسانیت نے کھلی کھلی بربریت کے ہاتھوں اتنے زخم نہیں کھائے جتنے جان لیوا گھاؤ اس نے قانون کی شکل میں جلوہ گر ہونے والی چنگیزیت کے ہاتھوں کھائے ہیں۔ ظلم جب ادارہ

قانون سازی میں نقب لگا کر آتا ہے اور عدالت کی کرسی پر اپنا پر تو ڈال دیتا ہے تو پھر انسانیت کے لیے کہیں پناہ نہیں رہتی۔

اسلام میں قانونی مساوات کا تصور پوری پوری طرح نمایاں ہے۔ اس کے ہاں ایک جرم کے لیے ایک ہی نظامِ عدالت ہے، ایک ہی طریقِ کارروائی ہے، ایک ہی فیصلہ ہے اور ایک ہی سزا ہے ــــ چاہے مجرم کسی طبقے اور کسی درجے کا ہو اور اس کے مقابلے میں مستغیث چھوٹے سے چھوٹا ہو، یا بڑے سے بڑا! اسلامی قانون میں تصورِ مساوات اتنا سیدھا سادھا ہے کہ وہ عام ملکی عدالتوں کے متوازی مخصوص قسم کی انتظامی عدالتیں قائم کرنے کا روادار نہیں ہے۔ یہ نہ سمجھیے کہ اسلامی نظام جس دور میں چلا تھا اس میں آدمی کے سامنے تقسیمِ عدالت کا مسئلہ آیا ہی نہیں تھا اور اس لیے ایک سادہ سا نظام اپنے مخصوص حالات کے تقاضوں کے مطابق چلتا رہا۔ نہیں، بلکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے ایک مرتبہ ایک گورنر کی زیادتی کے خلاف ایک معمولی شہری کی فریاد آئی اور آپ نے اس پر عام ملکی قانون کے تحت سزا دینے کا فیصلہ کیا تو آپ کے سامنے یہ مطالبہ بالکل متعین طریق سے رکھا گیا تھا کہ اگر آپ اس طرح شہریوں کی شکایات پر اپنے حکام اور عمال کو سزائیں دینے لگیں گے تو ان کا رعب و وقار ختم ہو جائے گا، ان کا معاملہ تو کچھ جداگانہ طریق سے ہونا چاہیے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس مطالبے کو قانونِ اسلامی کے مزاج اور اصولوں کے خلاف پا کر بالکل رد کر دیا۔ چنانچہ آپ جانتے ہیں کہ اسلام کے نظامِ عدالت و قانون نے یہ حیرت انگیز نظیریں قائم کر کے دکھائی ہیں کہ ایک عام شہری اور ایک خلیفۂ وقت ایک معمولی قاضی کی عدالت میں آمنے سامنے برابر کی حیثیت سے کھڑے ہیں اور قاضی بغیر اس کا لحاظ کیے قانون کا فیصلہ نافذ کر دیتا ہے کہ کون مستغیث ہے اور کون مستغاث علیہ! یہ مثالیں بادشاہی دور تک میں دیکھی جا چکی ہیں۔

کیا قانون و عدالت کی یہ قدریں وقتی اور سرسری قسم کی تھیں اور محض فرضی حالات کا تقاضا تھیں؟ ان کے پیچھے کوئی اصولیت تھی ہی نہیں؟ یقیناً یہ قدریں دائمی ہیں اور ان کی بنیاد اصولِ مساوات پر ہے کہ جس سے ہٹ کر قانون لاقانونی سے بدتر ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم ابتدا ہی میں واضح کر چکے ہیں کہ پرودا کی اصل روح ایک فوقیت یافتہ عنصر کی امتیاز

پسندی ہے اور اس کا پورا ڈھانچہ قانونی مساوات کے تقاضوں کے خلاف واقع ہوا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ "پروڈا" ہمارے ملک میں آہستہ آہستہ نشوونما پانے والی رولنگ کلاس کے ذہن کا ترجمان ہے۔ یہ رولنگ کلاس سے تعلق رکھنے والے مجرمین کو دوسرے مجرمین سے الگ کرتا ہے، ان کو ملک کی تعزیرات کے دائرۂ اثر سے باہر نکال لیتا ہے، ان کے جرائم میں بڑی سے بڑی عدالت کو فیصلہ دینے اور ان پر سزا نافذ کرنے سے روکتا ہے، ان کے لیے عام لوگوں سے جداگانہ سزائیں تجویز کرتا ہے اور ان کے لیے سرے سے طریقِ کارروائی کو بدل دیتا ہے۔

پروڈا کی دفعات اور اس سے متعلقہ قواعدِ کارروائی میں اصولِ مساوات کا خون جس طرح کیا گیا ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لیے ذیل کے حقائق کا مطالعہ ضروری ہے:۔

(۱) جن جرائم سے یہ قانون بحث کرتا ہے وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے شدید ترین جرائم ہیں اور ان کو عام قانونِ تعزیرات کے تحت فوجداری جرائم میں شمار ہونا چاہیے تھا۔ رشوت، خیانت، دانستہ بدانتظامی، سرکاری روپے کا ناجائز استعمال، اقربا نوازی اور منظورِ نظر لوگوں کی بے جا پاسداری و جنبہ داری، اور عہدہ دارانہ اثر و رسوخ سے ناجائز استفادہ۔ یہ ایسے اخلاقی جرائم ہیں جن کی زد میں حکومت، سوسائٹی اور مختلف افراد کا صرف ذہنی و اخلاقی مفاد ہی نہیں، عین مادی و مالی مفاد بھی آتا ہے اور چھوٹے پیمانے پر نہیں، بہت بڑے پیمانے پر آتا ہے۔ ان جرائم کا مزاج بالکل وہی ہے جو چوری، ڈکیتی، جیب تراشی، فریب دہی، ایذارسانی، اور دھاندلی سے حق ماری کرنے کا مجرمانہ مزاج ہوتا ہے۔ چنانچہ اس مزاج کے جتنے جرائم بھی ہوتے ہیں ان کے خلاف حکومت کی مشینری اول تو از خود، ورنہ کسی شہری کے استغاثے پر فوراً حرکت میں آ جاتی ہے۔ چنانچہ ہماری کتابِ تعزیرات ایسے ہی جرائم سے بحث کرتی ہے۔ اس کے باب نہم میں معمولی ملازمینِ حکومت کی رشوت ستانی اور خیانت کو فوجداری جرم کی حیثیت دی گئی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس معاملہ میں آخر کیا چیز مانع تھی کہ وزراء اور دوسرے نمائندہ عہدہ داروں کے ایسے جرائم کو بھی قانونِ تعزیرات کے تحت جرم قرار دے دیا جاتا؟ اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہے کہ عام شہریوں اور عام ملازمین کے مقابلے میں چونکہ معاملہ رولنگ کلاس کا تھا اس لیے پروڈا آگے بڑھا

اور اس نے اپنے مصنفین کی پوری کلاس کو تعزیرات پاکستان کے حدود سے نکال کر اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔

اس طرح کے جرائم اگر عام لوگ کرتے ہیں، تو ان کا نوٹس پولیس لیتی ہے، لیکن انہی کا ارتکاب خواص کے مقدس ہاتھوں سے ہوا ہو تو نوٹس لینا گورنر جنرل یا صوبائی گورنر کا کام ہے۔ وہی جرائم جن کے عام ملازمین مرتکب ہوں تو ضابطۂ فوجداری کے تحت کارروائی ہو ۔۔ انہی کا ارتکاب جب خداوندان مملکت اور فضیلت مآب اور عزت مآب حضرات کریں تو معاملہ پروڈا کے تحت نمٹایا جائے گا ۔۔۔۔۔ یہ اوئین بے انصافی ہے جسے قانون کا مقدس لباس پہنایا گیا ہے۔ مگر اس کی عریانی کو کوئی لباس ڈھانپنے پر قادر نہیں ہو سکتا!

(۲) شہریوں اور معمولی ملازمین کے خلاف پبلک کو عدالت میں براہ راست استغاثہ دائر کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن جب مجرم اکابر ملک ہوں تو کسی عدالت کو، حتیٰ کہ ہائیکورٹ اور فیڈرل کورٹ تک کو یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی شہری کی درخواست کی سماعت کر سکے۔ عدالت ریفرنگ اتھارٹی (گورنر جنرل یا صوبائی گورنر) کے فرمان تفویض کے صدور سے قبل بالکل بے بس ہے۔ رولنگ کلاس کے افراد کے خلاف اگر کسی شہری کو شکایت ہو تو وہ اپنی درخواست پہلے گورنر جنرل یا گورنر کے سامنے لائے اور پھر وہاں سے درخواست قابلِ تحقیقات قرار دی جائے تو مزید کارروائی ہوگی، ورنہ درخواست ڈسمس کر دی جائیگی۔

سوال یہ ہے کہ شہریوں سے یہ حق کیوں سلب کیا گیا ہے کہ وہ اپنے کسی خادم، یا اپنے کسی نمائندے کے ہاتھوں جب اپنے مفاد کو مجروح ہوتا ہوا دیکھیں تو براہ راست عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں؟

(۳) رولنگ کلاس کے افراد کے مذکورہ بالا جرائم کے بارے میں بڑی سے بڑی عدالت کا اختیار صرف اس حد تک محدود رکھا گیا ہے کہ وہ تحقیقات کرے گی۔ لیکن ایسے ہی جرائم اگر عام لوگوں سے سرزد ہوں تو ان پر فوجداری مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ پھر عدالت پروڈا کے تحت تحقیقات کرنے کے بعد بھی اس کی مجاز نہیں ہے کہ اپنا فیصلہ صادر کرے اور جرم ثابت ہونے کی صورت میں سزا نافذ کرے۔ حالانکہ عام لوگوں کے بارے میں عدالتیں ایسے جرائم پر فیصلے دیتی ہیں اور سزائیں نافذ کرتی ہیں۔ پروڈا میں عدالت کا کام اپنے

نتائج تحقیق رپورٹنگ اتھارٹی کے سامنے پیش کر دینے پر ختم ہو جاتا ہے۔

ذرا ہم کو پروڈا کے پیچھے کام کرنے والے دماغوں میں سے کوئی (خصوصاً گورمانی صاحب) یہ سمجھا دیں کہ ایک وزیر یا عوامی نمائندہ اگر واقعی عدالت کی نگاہ میں مذکورۂ بالا جرائم میں سے کسی کا مجرم ثابت ہو جائے تو وہ کونسی معقول دلیل ہے جس کی بنا پر عدالت کو فیصلہ دینے اور سزا نافذ کرنے سے باز رکھا گیا ہے؟ اس فیصلے اور سزا کے معاملے کو عدالت کے ہاتھوں سے نکال کر آخر انتظامیہ کے حوالے کیوں کیا گیا ہے؟ کیا آپ کو اپنی ہی عدالتوں پر اعتماد نہیں ہے؟

(۴) عام لوگ اگر اس درجے کے بڑے جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں تو ان کو تعزیرات پاکستان کے تحت عدالتیں جیل بھیجتی ہیں۔ لیکن پروڈا کی عدالت وزراء اور پارلیمنٹری سیکرٹریوں اور پارلیمنٹ ور اسمبلیوں کے ممبروں کو ایسے ہی جرائم پر صرف مناصبِ نمائندگی سے چند سال کے لیے محروم کرنے پر اکتفا کرتی ہے۔ ایک طرح کے جرائم پر عام لوگوں اور خاص لوگوں کے لیے الگ الگ سزاؤں کا نفاذ کس منطق سے آخر مساوات کی تعریف میں داخل کیا جا سکتا ہے؟ اختیارات کے زور سے قانون تو آپ جیسے چاہیں بنا دیں، لیکن محض اختیارات کے زور سے ان کو معقول اور مبنی بر انصاف ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے معقول استدلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کوئی معقول استدلال ہو تو لائیے، ورنہ ایک لفظ "ایمرجنسی" تو سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے ہیں۔

(۵) پروڈا میں ترمیم کرنے والا ۲۲ جنوری ۵۲ء کا آرڈی ننس اپنی دفعہ ۴، ۵، ۶ کے رُو سے یہ قرار دیتا ہے کہ اگر پروڈا کے تحت درخواست دہندگان میں سے کسی کے خلاف یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے دانستہ غلط الزام لگایا ہے یا جان بوجھ کر کوئی جھوٹا بیان دیا ہے تو یہ ایک ایسا جرم ہوگا جس پر تین سال کی قید یا جرمانے کی سزا یا دونوں سزائیں اکٹھی دی جا سکیں گی۔ یہی ترمیم اب تعزیراتِ پاکستان میں شامل کر دی گئی ہے۔ آپ سوچیے کہ اگر مستغیث کا بہتان ثابت ہو جائے تو اس کو تو یہ سزا ملے گی، لیکن اگر اس کا الزام درست نکلے تو اکابر مجرمین کو صرف مناصبِ نمائندگی سے برطرف کیا جا سکتا ہے، وہ بھی اس صورت میں جب کہ گورنر جنرل ایسا کرنا مناسب سمجھے۔ اس قانون میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ تحقیقات سے الزامات ثابت ہو جانے کے

بعد اس عہدہ دار پر فوجداری مقدمہ بھی قائم کیا جائے گا اور اسے بھی وہ سزا دی جائے گی جو الزامات غلط ثابت ہونے کی صورت میں جھوٹا الزام لگانے والے کے لیے تجویز کی گئی ہے۔

کیا یہ شانِ مساوات ہے؟ اگر واقعی یہ اُسی اسلامی مساوات کا مظاہرہ ہے جس کے ذکر سے قراردادِ مقاصد مزیّن ہے اور جس کو تقریروں میں دوہراتے ہوئے ہمارے بڑے لوگ تھکتے نہیں تو پھر نہ جانے عدمِ مساوات کا اطلاق کس شے پر ہوتا ہوگا!

اسلامی قانون میں ایک ایسی نظیر موجود ہے جسے اس معاملے میں معیار بنایا جاسکتا ہے۔ زنا کی سزا رجم ہے یا سو کوڑے۔ لیکن اتنی سنگین سزا کے ساتھ اس امر کا امکان پیدا ہو رہا تھا کہ لوگ باہمی عداوت کے تحت ایک دوسرے کو ایسی ہولناک سزا دلوانے کے لیے زنا کے جھوٹے مقدمات نہ لانے لگیں۔ اس لیے اسلامی قانون نے شہادت کا معیار سخت کرنے کے ساتھ ساتھ زنا کی تہمت لگانے کے لیے بھی بہت سخت سزا مقرر کر دی ـــــ یعنی اسّی کوڑے! یہاں سے آپ زنا کے واقعی مجرم اور زنا کی جھوٹی تہمت لگانے والے مجرم کی سزا کا تناسب اخذ کر کے اس کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں کہ کیا پروڈا کے تحت بھی اصل جرم اور اس جرم کے بہتان کی سزاؤں کا تناسب ٹھیک مقرر کیا گیا ہے؟ ہرگز نہیں!

**شہریوں کی طرف سے استغاثے پر نارواپابندیاں**

یہ بات محتاجِ دلیل نہیں کہ ایک عام شہری کے لیے کسی مرکزی یا صوبائی وزیر، پارلیمنٹری سیکرٹری یا ایم ایل اے یا کسی دوسرے اونچے عہدہ دار کے خلاف مستغیث بن کر کھڑے ہونا کوئی آسان چیز نہیں ہے۔ اس میں بے شمار خطرات اس کے سامنے ہوتے ہیں اور موجودہ حالات کے لحاظ سے استغاثے کی کامیابی بہت مشکوک ہوتی ہے (کیونکہ استغاثے کا آخری فیصلہ عدالت کے ہاتھ میں نہیں، انتظامیہ کے ہاتھ میں ہے، جس کا ایک پرزہ پیشِ نظر عہدہ دار بھی ہوگا) اور ناکامی کے معنی جو کچھ ہو سکتے ہیں ان کا اندازہ کرنا بھی مشکل نہیں ہے۔ پھر اس قسم کی غیر معمولی جرأت سے عام لوگ ایسے معاملات میں تو کام لے سکتے ہیں جن میں براہِ راست ان کو کوئی بھاری نقصان پہنچا ہو یا ان سے کوئی بے انصافی کی جا رہی ہو، لیکن ملک و قوم کے مجموعی مفاد کو نقصان پہنچتے یا پبلک سے عام بے انصافی ہوتے دیکھ کر اس درجے کی جسارت کرنا کم ہی لوگوں کے حصے میں آسکتا ہے۔

مگر پروڈا نے اتنی بھاری رکاوٹ کے موجود ہوتے ہوئے کچھ اور پابندیاں بھی شامل کر دی ہیں جن کے بعد اس امر کا بہت ہی کم امکان رہ جاتا ہے کہ عام لوگ اپنے اکابر کی بدکرداریوں کے خلاف مستغیث بن کر آئیں۔

۶ جولائی ۱۹۴۹ء کے قواعد کی دفعہ ۲ میں قرار دیا گیا تھا کہ پروڈا کے تحت عام شہری جو درخواست دیں اس پر کم سے کم پانچ افراد کے دستخط ہونے چاہئیں۔ دفعہ ۳ کا تقاضا یہ تھا کہ درخواست کے ساتھ الزامات کا خلاصہ مرتب کر کے شامل کیا جائے، گواہوں کی فہرست دی جائے اور خلاصۂ الزامات کے بارے میں ان کی شہادتیں درج کی جائیں۔ نیز ضروری مسودات کی فہرست مع نقول ساتھ شامل کی جائے (یہاں تک تو خیر!) علاوہ بریں یہ بھی ضروری ہے کہ درخواست کے ساتھ پانچ ہزار روپیہ سرکاری خزانے میں ضمانت کے طور داخل کر کے اس کی رسید منسلک کر دی جائے۔

۲۷ جون ۱۹۵۰ء کے قواعد کی دفعہ ۴ اور دفعہ میں یہ پابندیاں قریب قریب جوں کی توں رکھی گئی ہیں۔ پھر اوّل الذکر قواعد میں بھی (جو منسوخ ہو چکے ہیں)، اور آخر الذکر قواعد میں بھی علی الترتیب دفعہ ۸ شق ۲ اور دفعہ ۹ شق ۱ کے تحت اگر درخواست ریفرنگ اتھارٹی کی نگاہ میں وثوق حاصل نہ کر سکنے کی وجہ سے ڈسمس ہو جائے تو ریفرنگ اتھارٹی ضمانت کی پوری رقم یا اس کے کسی حصے کی ضبطی کا حکم دے سکتی ہے۔

ظاہر بات ہے کہ مشکل ہی سے کوئی شہری اتنا جرأت مند ہو سکتا ہے کہ وہ حکومت کے کسی بڑے عہدہ دار کی دشمنی مول لینے کا اقدام کرتے ہوئے اول تو چار مزید جرأت مند ساتھی تلاش کرے، پھر اپنے مال اور وقت کے صرف سے درخواست دینے کے مذکورۂ بالا تقاضے پورے کرے اور پھر اپنی اور اپنے ساتھیوں کی پانچ ہزار روپے کی رقم کو خطرے میں ڈال دے!

یہ سب پابندیاں تو جو کچھ تھیں، تھیں۔ لیکن اسی دوران میں ایک "امر عجبی" یکایک دریائے سندھ سے نکل آئی۔ سندھ میں جو پارٹی بازی اور لیڈروں میں جو کشمکش ہو رہی ہے اس کی وجہ سے کھوڑو کے خلاف پروڈا کے تحت درخواستوں پر درخواستیں دی جاتی رہی ہیں۔ کھوڑو صاحب ایک دو واروں سے بچ نکلے لیکن تیسری مرتبہ پھر وار ہو گیا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اصل معاملہ کیا تھا، لیکن یکایک اخبارات نے اطلاع دی کہ مرکز کے سندھی وزیر پیرزادہ عبدالستار کے خلاف پروڈا کے تحت ایک درخواست داغ دی گئی ہے

اور دوسرے مرکزی وزراء پر بھی داغی جانے والی ہے۔ اس پر زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ پروڈا کا ایک نیا ترمیمی آرڈی ننس (مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۵۲ء) مرکز سے جاری ہوگیا۔ یہ آرڈی ننس شہری درخواست دہندگان کے لیے مزید رکاوٹیں اپنے ساتھ لایا۔ ان کی رکاوٹوں میں سے ایک رکاوٹ تو "اخفاء اور رازداری" کی رکاوٹ ہے جس پر ہم آگے گفتگو کریں گے۔ لیکن دوسری بڑی رکاوٹ اس ترمیمی آرڈی ننس کی دفعہ ۸ نے بہم پہنچادی ہے۔ ہم اس کا پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ اس دفعہ کی رو سے دانستہ غلط بیانی ایک جرم ہے اور اس جرم پر آدمی کو دفعہ ۹ کے تحت ۳ سال تک کے لئے جیل بھیجا جا سکتا ہے یا جرمانہ کیا جا سکتا ہے یا دونوں سزائیں بیک وقت دی جا سکتی ہیں۔

اب آپ سوچئے کہ ایک وزیر یا پارلیمنٹری سیکرٹری یا نمائندگی کے منصب پر فائز ہونے والا کوئی عہدہ دار اگر اپنی اُسی بدکرداری سے کام لے کر جس کے خلاف فریاد کی جا رہی ہو، گواہوں کو توڑ لے یا کوئی گڑبڑ کرے یا کسی دوسری صورت میں کوئی شہری اپنے عائد کردہ الزامات کو ثابت کرنے سے قاصر رہے تو دفعہ ۸ بہرحال اس کے لئے ایک بڑے خطرے کا امکان (یہاں صرف لفظ "امکان" ہی سامنے رہے) بن کر سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔

اِس طرح شہریوں کے لیے پروڈا کے تحت کوئی درخواست دینا اتنا مشکل بنا دیا گیا ہے کہ اب یہ قانون صرف "ریفرنگ اتھارٹی" ہی کے لیے قابلِ استعمال رہ گیا ہے۔

**رازداری اور اخفاء** پبلک مناصب پر رہ کر جس "بدکرداری" کا ارتکاب کوئی شخص کرتا ہے اس کا براہِ راست ضرر پبلک ہی کو پہنچتا ہے۔ اندریں حالات پبلک کا یہ بنیادی حق ہے کہ ایسے استغاثوں کی کارروائیوں سے اسے پوری طرح واقف رکھا جائے۔ وہ جان سکے کہ اس کے کارپردازوں میں سے کس کس کے بارے میں کیا الزام لگایا گیا، کس نے الزام لگانے کی جرأت کی ہے، ابتدائی تحقیقات میں کیا چیزیں سامنے آئیں، ان پر ریفرنگ اتھارٹی نے کیا حکم دیا اور کن دلائل کے ساتھ دیا، پھر عدالت کی تحقیقات کا خلاصہ کیا نکلا، پھر جب عدالت کے نتائج تحقیق انتظامیہ کو لوٹائے گئے تو اس نے کیا ریمارک دیے اور کس کارروائی کا فیصلہ کیا، کسی درخواست دہندہ کی درخواست مزید تحقیق کے قابل نہ قرار پائی تو اس کے وجوہ کیا تھے، اور کسی

بیان دینے والے کو اگر وافستہ غلط بیانی کے جرم پر سزا دی گئی تو اس جرم کی حقیقت کیا تھی، وغیرہ۔

یہ چیزیں اگر عین اسی پبلک سے چھپائی جائیں جس کے یہ لوگ نمائندہ ہیں اور جس کے مفاد پر ان کی بدکرداریوں کا براہِ راست اثر پڑتا ہے، تو یہ اخفاء اور رازداری صرف "مشتبہ" ہی نہیں، بلکہ صریح غیر منصفانہ بھی ہوگی۔ ہاں اگر رازداری کا منشا یہ ہو کہ کارروائی کے دوران میں کچھ ایسے امور بھی آسکتے ہیں جن کے برسرِ عام آنے سے دفاع یا خارجی معاملات وغیرہ پر بُرا اثر پڑتا ہو تو ہم بھی اسے جائز سمجھتے ہیں کہ کارروائی کے ایسے حصوں کو بند کمرے میں انجام دیا جائے، اور ایسا پہلے بھی حکومت و عدالت کے معمولات میں شامل ہے مگر پروڈا میں تو رازداری کا دائرہ بڑا وسیع کر دیا گیا ہے۔

ملاحظہ ہو:-

۲۲ جنوری سنہ ۵۲ء کے ترمیمی پروڈا کی دفعہ ۲ میں واضح کر دیا گیا ہے کہ پروڈا ایکٹ کے تحت ہونے والی کارروائیوں سے پبلک کو بے تعلق ( Excluded ) قرار دیا گیا ہے اور کارروائی سے متعلقہ معلومات کو افشا کرنے اور شائع کرنے کو ممنوع ٹھیرایا گیا ہے۔ اس کی خلاف ورزی ایک جرم ( Offence ) ہوگی۔ دفعہ ۳ کا تقاضا یہ ہے کہ ریفرنگ اتھارٹی پر کوئی اظہار رائے جائز نہ ہوگا، اور نہ کارروائی کے دوران سماعت میں اس پر کسی طرح کی رائے زنی کی اشاعت کی جاسکے گی۔ اس دفعہ کی خلاف ورزی کو بھی باضابطہ جرم قرار دیا گیا ہے۔

۲۷ جون سنہ ۵۰ء کے قواعد میں ۲۳ جنوری سنہ ۵۲ء کے حکمنامے ( Notification ) سے جو ترامیم اور اضافے کیے گئے تھے ان میں سے ایک کے رو سے ایک مستقل نئی دفعہ کئی شقوں اور اجزاء کے ساتھ المضاعف کی گئی تھی۔ اس کا منشا یہ تھا کہ پروڈا اور اس کے تحت ہونے والی وہ تمام کارروائیاں جو معاملے کے عدالت (یا ٹریبونل) میں پیش ہونے سے قبل عمل میں آئیں، ان میں بجز اس کے کہ ریفرنگ اتھارٹی خود حکم جاری کرے، پبلک کو حصہ لینے کا موقع نہیں دیا جا سکتا۔ نیز نہ تو درخواست دہندگان کے حلف ناموں اور نہ مسل سے متعلقہ کسی مسودہ کے مندرجات بہ شمول درخواست متعلقہ دفعہ ۳ (شہری مستغیث کی طرف سے استغاثہ کی درخواست) کو، اور نہ اس طرح کی کارروائی سے متعلقہ کسی بھی

معلومات کو شائع کرنے یا معلوم کرانے کی اجازت ہے۔ پھر عدالت اور ٹربیونل کو بھی یہ دفعہ اختیار دیتی ہے کہ حفاظتِ رازداری کے دوسرے اختیارات کے علاوہ وہ مجاز ہے کہ کارروائی کے جس حصے کو چاہے ساری پبلک یا اس کے کسی حصے سے اخفا میں رکھے اور کسی متعلقہ مسودے کے مندرجات یا اس سلسلے کی کارروائی سے متعلقہ معلومات کی اشاعت اور ان کے افشار کرنے کی ممانعت کر دے۔ رازداری کے اس اہتمام کو مکمل کرنے کے لیے اسی دفعہ میں یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ ریفرنگ اتھارٹی جن اشخاص اور دفتری عملے کو چاہے خاص طور پر مامور کر سکتی ہے۔

اہتمامِ رازداری کی یہ آخری حد ہے۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ اس قانون کے رُو سے درخواست دہندہ کی درخواست کے ساتھ جو سلوک بھی روا رکھا جائے اُس پر جن دلائل سے جو بھی فیصلہ دیا جائے، پھر عدالتی تحقیقات جو کچھ بھی ہو اور پھر اس پر ریفرنگ اتھارٹی جو حکم بھی دے، ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس سے پبلک واقفیت حاصل کرنے کا حق رکھتی ہو، یا جس کے بارے میں درخواست دہندہ اپنی کوئی فریاد رائے عام کے سامنے لا سکے ——— اس کا منشا آخر اس کے سوا اور کیا ہے کہ رولنگ کلاس کے افراد میں سے کوئی چاہے کتنے ہی بڑے جرم کا اور اپنی ہی پبلک کے خلاف بدکرداری کرنے کا مجرم کیوں نہ ہو اور چاہے وہ پروڈا کی بڑی سے بڑی سزا کیوں نہ پا لے، پبلک کو اس کا اعمال نامہ ریفرنگ اتھارٹی کی مرضی کے بغیر معلوم نہ ہونے دیا جائے۔ انتظامیہ کے لیے ان قواعد کے ہوتے ہوئے اس معاملے میں اتنا بڑا اختیار مہیا کر دیا گیا ہے کہ پروڈا کے تحت آنے والے جس عہدہ دار کی سیرت کو چاہے پبلک پر پوری طرح نمایاں کر دے اور جس کی عزت چاہے، بچا لے! اس کا دار و مدار صرف اس امر پر ہے کہ رولنگ کلاس کا کونسا فرد مرکزی اقتدار کا نیاز مند ہے اور کون اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکا ہے۔ اسی لحاظ سے جب ضرورت ہو گی پردہ اٹھایا جائے گا اور جب مناسب سمجھا جائے گا گرا دیا جائے گا۔

**خلاصہ** اوپر کے اشارات کی روشنی میں اگر پروڈا اور اس کے متعلقہ قواعد کارروائی پر غور کیا جائے تو انصاف یہ کہتا ہے کہ سب سے پہلے جو لوگ مقدمہ چلائے جانے کے مستحق ہیں وہ خود پروڈا کے مصنفین

ہیں۔ کیونکہ قانون سازی کے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی اس سے زیادہ گھناؤنی مثال شاید دنیا کی تاریخ قانون سازی میں کہیں نہ ملے گی۔

اس تجزیہ کا منشا نہ تو یہ ہے کہ ایک مقالہ لکھا جائے اور شائع ہو جائے، نہ یہ ہے کہ محض اپنے حکمرانوں پر تنقید کر کے دل کا بخار نکال لیا جائے، بلکہ ہم اپنے عوام میں یہ احساس بیدار کرنا چاہتے ہیں کہ ملک میں ایک ایک کر کے جو قوانین بن رہے ہیں وہ اسی غلط قسم کے تصورِ انصاف اور طرزِ قانون سازی پر مبنی ہیں جس کا ایک مظہر پروڈا ہے۔ یہ قوانین آہنی زنجیریں ہیں جو ایک ایک کر کے ہمارے حقوقِ شہریت کے اعضا پر لپٹ رہی ہیں۔ ان زنجیروں کو صبر و سکون سے گوارا کر لینا سخت خطرناک ہے، کیونکہ آگے چل کر جب ان کا بوجھ محسوس ہوگا اور ترقی کی طرف بڑھنے میں جب یہ رکاوٹ بنیں گی تو اس وقت ان کے چنگل سے نکلنا ممکن نہ ہوگا۔ ان زنجیروں کی کڑیوں کا ڈھلتے چلے جانا اور ہماری آزادی اور ہمارے حقوق کے ہاتھ پاؤں جکڑتے چلے جانا بالآخر ایک ناقابلِ تبدیل ڈکٹیٹر شپ پر منتج ہوگا۔

پروڈا اور سیفٹی ایکٹ اور سیکورٹی ایکٹ جیسے قوانین گوارا کر لے جانے والی قوم کے بارے میں دنیا میں تو یہی رائے قائم کی جائے گی کہ یہ سوچنے سمجھنے والے اور حساس انسانوں کی قوم نہیں ہے بلکہ بھیڑ بکریوں کا ایک گلہ ہے جسے کچھ معلوم نہیں کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

---

# رسائل و مسائل

## شکار کرنے اور شکار کھیلنے میں فرق

**سوال:** امیر لوگ آج کل جس طرح شکار کھیلتے ہیں، اسے دیکھ کر دل بے قرار ہوتا ہے۔ سابق زمانہ میں تو شاید لوگ قوتِ لایموت کے لئے شکار کو ذریعہ بناتے ہوں گے۔ مگر آج کل تو یہ ایک تفریح اور تماشا ہے۔ بعض لوگ جنگل یا کسی کھیت میں جال لگا کر خرگوش پکڑتے ہیں۔ پھر ان کو بوریوں میں ڈال کر کسی میدان میں لے جاتے ہیں اور ان کے پیچھے کتے چھوڑتے ہیں۔ خرگوش کو کھلی جگہ میں کوئی جائے پناہ نہیں ملتی تو وہ دوڑ دوڑ کر ہار جاتا ہے اور کتے اسے پھاڑ ڈالتے ہیں۔ اس پر خوب تفریح کی جاتی ہے۔

یہ بھی دریافت طلب ہے کہ بندوق سے شکار کرنا کیسا ہے؟ اس معاملے میں میرے سامنے پارہ دوم کی یہ آیت ہے کہ "واذا تولی سعی فی الارض لیفسد فیھا و یھلک الحرث والنسل، واللہ لا یحب الفساد۔"

کتبِ فقہ میں یہ مسئلہ جو درج ہے کہ تکبیر پڑھ کر شکار پر کتا چھوڑا جائے یا بندوق چلائی جائے تو شکار اگر زخمی ہو کر بغیر ذبح کئے مر جائے تو بھی وہ حلال ہے، اس کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

**جواب:** شکار کھیلنا میرے نزدیک مکروہ ہے، البتہ شکار کرنا جائز ہے۔ شکار کرنے اور کھیلنے میں فرق یہ ہے کہ جو شکار کھانے کے لیے کیا جائے خواہ بہ ضرورت ہو یا بلا ضرورت وہ جائز ہے۔ اور جو شکار محض تفریحاً کیا جائے اور جس میں خواہ مخواہ جانوروں کی جانیں ہلاک کی جائیں وہ اگر ناجائز نہیں تو مکروہ ضرور ہے۔ کسی جانور پر اگر شکاری کتے یا دوسرے شکاری جانور کو اللہ کا نام لے کر چھوڑا جائے اور وہ شکاری

جانور کے حملے سے مر جائے تو اس کا کھانا ازروئے قرآن جائز ہے۔ اور اگر تیر اللہ کا نام لے کر چھوڑا جائے اور اس کی ضرب سے جانور مر جائے تو اس کا کھانا ازروئے حدیث جائز ہے۔ پہلی چیز کی دلیل سورۂ مائدہ کے پہلے رکوع میں موجود ہے اور دوسری چیز کی دلیل کے لیے حدیث کی کسی کتاب میں کتاب الصید نکال کر دیکھ لیجیے۔ بندوق کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ کتب فقہ میں مذکور نہیں ہے۔

---

## ایک نیا فتنہ

سوال:۔ یہاں کیمپ میں ایک صاحب علم نے پچھلے ماہ رمضان میں ایک فتنہ کھڑا کیا تھا کہ رمضان کے بارے میں سورۂ بقرہ کی آیات بیک وقت نازل ہوئی تھیں، اس لئے اللہ نے شروع میں جو رعایت دی ہے کہ "جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں، اور پھر نہ رکھیں، تو وہ فدیہ ادا کریں" یہ ایک اٹل رعایت ہے اور اب بھی اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کی حمایت میں آیت ۱۸۳ کے آخری حصہ کو پیش کیا کہ اگر روزہ رکھو تو بہتر ہے اور نہ رکھو تو فدیہ ادا کر دو۔ ان کا کہنا تھا کہ آیت ۱۸۴ پہلی آیات کے ساتھ ہی نازل ہوئی تھی، وہ پہلی آیات کی رعایت کو کیسے چھین سکتی ہے۔

آپ کی تفسیر کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ آیات ۱۸۲، ۱۸۳ تو جنگ بدر سے پہلے سنہ ۲ھ میں نازل ہوئیں۔ اور آیت ۱۸۴ ایک سال بعد نازل ہوئی۔ اگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو پھر ان کے اس خیال کی تردید ہو سکتی ہے کہ آج بھی ایک تندرست بتاکٹا انسان فدیہ دے کر روزے کی فرضیت سے بچ سکتا ہے۔

مذکورۂ بالا صاحب اپنے آپ کو علم حدیث کے استاد اور قرآن کے مفسر سمجھتے ہیں۔ اور ہر دو کے متعلق اپنے افکار و خیالات دنیا کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ آپ براہ مہربانی کچھ تکلیف گوارا کر کے ان کتب کا حوالہ دے دیں جن سے آپ کو ثبوت ملا ہو کہ آیات ۱۸۲ اور ۱۸۳ تو ۲ھ میں جنگ بدر سے پہلے نازل ہوئیں، اور آیت ۱۸۴ ایک سال بعد نازل

ہوئی۔ اس طرح ہمارے پاس ایک سند ہو جائے گی اور ہم انہیں اپنے فاسد خیالات کی نشر و اشاعت سے باز رکھنے کی کوشش کریں گے۔ یہ اسلام کی ہی خدمت ہے۔ امید ہے کہ آپ ضرور ہمیں اپنے افکارِ عالیہ سے مستفید فرمائیں گے۔

**جواب** :۔ اس سوال میں جس فتنے کا ذکر کیا گیا ہے اُس کا منشا تو خود اس کے موضوع و مضمون ہی سے ظاہر ہے۔ اس کے مصنف کا صاف مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان میں روزے رکھنے کی "مصیبت" سے خود بھی بچیں اور اپنے ہم مشرب "صاحب لوگوں" کو بھی بچائیں۔ عام فساق غنیمت ہیں کہ کھلی کھلی نافرمانی کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور جو نافرمانی کرنا چاہتے ہیں اسے بے محابا کر گزرتے ہیں۔ ان میں کم از کم یہ مکاری موجود نہیں ہے کہ خدا کی نافرمانی کرنے کے لئے خود خدا ہی کی کتاب کو حجت بنائیں۔ لیکن یہ نرالی قسم کے فساق وہ ہیں کہ اپنے فسق و فجور کے لئے قرآن کو آڑ بناتے ہیں، اور قرآن سے یہ خدمت لینے ہی کے لئے انہوں نے اس کا رشتہ حدیث سے توڑا ہے تاکہ اس کی آیات کو جیسے چاہیں معنی پہنائیں۔ ان لوگوں کو آج کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے۔ جس جس طرح چاہتے ہیں خلق خدا کو خدا کی کتاب کا نام لے لے کر خدا کے دین سے پھیرتے ہیں۔ پہلے انہوں نے "دو قرآن" تصنیف کئے تھے۔ پھر "دو اسلام" وضع کئے۔ آگے چل کر "دو خدا" بھی بنا ڈالیں تو کون ان کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے۔

روزوں کے بارے میں قرآن سے جو غلط استدلال انہوں نے کیا ہے اس کی غلطی واضح کرنے کے لئے سب سے پہلے ہم خود قرآن کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ زیر بحث آیات کا لفظی ترجمہ یہ ہے:

"اے لوگو جو ایمان لاتے ہو، لکھ دیئے گئے تم پر روزے جس طرح لکھے گئے تھے تم سے پہلے کے لوگوں پر، تاکہ تم پرہیزگاری کرو۔ روزہ رکھنا چند گنے چنے دنوں کا۔ پھر جو کوئی تم میں سے مریض ہو، یا سفر پر ہو، تو پورا ہونا چاہیے شمار دوسرے دنوں سے۔ اور جو لوگ اس کی (یعنی روزے کی)، طاقت رکھتے ہوں اُن پر فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا۔ پھر جو کوئی رضاکارانہ بجا لائے نیکی تو وہ بہتر ہے اُسی کے لئے۔ اور یہ کہ تم روزہ رکھو، یہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم علم رکھتے ہو۔ ماہ رمضان وہ ہے جس میں نازل کیا گیا قرآن، رہنما بنا کر انسانوں

کے لئے، اور روشن آیات لئے ہوئے ہدایت اور تفریق حق و باطل کی۔ پس جو پائے تم میں سے اس مہینے کو تو چاہیے کہ اس کے روزے رکھے۔ اور جو مریض ہو یا سفر پہ ہو تو پورا ہونا چاہیے شمار دوسرے دنوں سے"

(ملاحظہ فرمایئے سورۂ بقرہ رکوع ۲۳۔ اور اصل سے مقابلہ کرکے خوب اطمینان کر لیجئے کہ اصل اور ترجمے میں معنی کے لحاظ سے کوئی فرق تو نہیں ہے)،

اس عبارت کو جو شخص خالی الذہن ہو کر پڑھے گا اس کے دل میں لازماً پہلا سوال یہ پیدا ہوگا کہ اگر یہ پوری عبارت ایک ہی سلسلۂ تقریر کی ہے جو بیک وقت ارشاد ہوئی تھی تو اس میں پہلے ہی یہ کیوں نہ کہہ دیا گیا کہ ماہ رمضان میں تم کو یہ نعمت دی گئی تھی اس لئے تم میں سے جو اس کو پائے اُسے چاہیئے کہ اس مہینے کے روزے رکھے؟ آخر یہ کیا اندازِ بیان ہے کہ پہلے کہا "روزہ رکھنا چند گنے چُنے دنوں کا"، پھر تین چار فقروں میں روزوں کے متعلق بعض احکام بیان کئے، پھر بتایا کہ وہ گنے چُنے دن رمضان کے ہیں اور رمضان کو اِس کام کے لئے اِس وجہ سے منتخب کیا گیا ہے اور اس پورے مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ ایک مربوط سلسلۂ تقریر میں شاید ایک اناڑی بھی اپنی بات یوں ادا نہ کرتا، بلکہ یوں کہتا کہ اگلی قوموں کی طرح تم پر بھی روزے فرض کئے گئے ہیں، اور چونکہ رمضان کے مہینے میں تم کو قرآن کی نعمت دی گئی ہے اس لئے یہ فرض روزے تم اس مہینے میں رکھو۔ اِس کے بعد اس کو جو کچھ احکام بیان کرنے ہوتے وہ بیان کر دیتا۔

دوسرا سوال ایک خالی الذہن ناظر کے دل میں یہ پیدا ہوگا کہ اس سلسلۂ عبارت میں جب پہلے یہ فقرہ آچکا تھا کہ "جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو پورا ہونا چاہیے شمار دوسرے دنوں سے"، تو اسی فقرے کو بعد میں پھر دُہرانے کی کیا حاجت تھی؟ اور اگر فی الواقع اس کا دُہرانا ضروری تھا تو پھر یہ فقرہ بھی کیوں نہ دُہرایا گیا کہ "جو لوگ اُس کی طاقت رکھتے ہوں ان پر فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا"؟ حقیقت میں ضرورت تو دونوں میں سے ایک کو بھی دہرانے کی نہ تھی۔ لیکن ایک کو دہرانا اور دوسرے کو نہ دُہرانا تو ایک معما سا محسوس ہوتا ہے؟

تیسرا سوال جو اس کے دل میں کھٹکے گا وہ یہ ہے کہ "ماہ رمضان وہ ہے" سے پہلے کی عبارت اور اس

کے بعد کی عبارت کا مضمون ایک دوسرے سے صریحاً متناقض نظر آتا ہے۔ پہلا مضمون صاف طور پر یہ کہہ رہا ہے کہ جو شخص طاقت رکھنے کے باوجود روزہ نہ رکھے وہ فدیہ دے دے، لیکن اگر وہ روزہ ہی رکھے تو یہ اسی کے حق میں اچھا ہے۔ اس کے بالکل برعکس دوسرا مضمون یہ ظاہر کر رہا ہے کہ جو شخص ماہ رمضان کو پائے وہ اس میں ضرور روزہ رکھے، اور اس لازمی حکم کو یہ بات مزید تقویت پہنچا رہی ہے کہ اس حکم کے بعد اُس رعایت کا تو پھر اعادہ کر دیا گیا ہے جو پہلے مضمون میں مریض اور مسافر کو دی گئی تھی، مگر اُس رعایت کو ساقط کر دیا گیا ہے جو اوپر روزے کی طاقت رکھنے والے کو دی گئی تھی۔ ایک معمولی عقل و خرد رکھنے والے قانون ساز سے بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ایک ہی معاملہ میں وہ بیک وقت دو مختلف احکام دے گا۔ پھر بھلا یہ فعل اللہ تعالےٰ کے شایانِ شان کیسے ہو سکتا ہے؟

پہلے دو سوالات تو صرف سوالات ہی ہیں، لیکن یہ آخری سوال تو ایک سخت اعتراض ہے جو اس عبارت پر وارد ہوتا ہے، اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص حدیث سے مدد لئے بغیر اسے کیسے رفع کر سکتا ہے۔ جو لوگ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کو سمجھنے کے مدعی ہیں، اور حدیث کو احکامِ دین کا ماخذ اور قرآن کی مستند شرح ماننے سے انکار کرتے ہیں، ان سے پوچھیے کہ ان کے پاس ان سوالات اور اس اعتراض کا کیا جواب ہے؟

اب دیکھیے کہ حدیث کس طرح ہمیں قرآنِ مجید کے اس مقام کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ جن لوگوں کے سامنے قرآن کے یہ احکام نازل ہوئے تھے، ان کا بیان یہ ہے کہ اس عبارت کا ایک حصہ جو "اے لوگو" سے شروع ہو کر "اگر تم علم رکھتے ہو" پر ختم ہوتا ہے، ابتداءً نازل ہوا تھا، اور دوسرا حصہ اس کے ایک سال بعد نازل ہوا۔ پہلے سال روزے فرض کرتے وقت یہ رعایت رکھی گئی تھی کہ آدمی روزے کی طاقت رکھنے کے باوجود اگر روزہ نہ رکھے تو فدیہ دے دے۔ مگر دوسرے سال اس رعایت کو منسوخ کر دیا گیا، البتہ مسافر اور مریض کے لئے سابق رعایت بحال رکھی گئی۔

اس بیان سے نہ صرف یہ کہ سارے اِشکالات رفع ہو گئے، بلکہ یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ دوسرے سال آخری اور قطعی حکم دیتے ہوئے یہ تمہید کیوں اٹھائی گئی کہ یہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں تمہیں قرآن جیسی نعمت دی گئی ہے۔ اب بات سمجھ میں آ گئی کہ پہلے اللہ کی اس نعمت کا احساس دلایا گیا، پھر حکم دیا گیا کہ اس

نعمت کے شکریے میں تم کو اس مہینے کے روزے ضرور رکھنے چاہئیں۔

محدثین و مفسرین نے یہ تشریح متعدد صحابہ اور تابعین سے نقل کی ہے۔ مثلاً امام احمد ابن حنبل حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے ایک طویل تشریحی بیان نقل کرتے ہیں جس میں وہ فرماتے ہیں کہ نماز اور روزہ، دونوں کی موجودہ صورت بتدریج قائم کی گئی ہے۔ نماز میں پہلے بیت المقدس کی طرف رُخ کیا جاتا تھا، پھر مکے کی طرف رُخ پھیرا گیا۔ پہلے لوگ ایک دوسرے کو نماز کے وقت کی اطلاع دیتے تھے۔ پھر اذان کا طریقہ مقرر کیا گیا۔ پہلے طریقہ یہ تھا کہ اگر ایک شخص بیچ کے کسی مرحلے پر آکر جماعت میں شریک ہوتا تھا تو اپنی نماز کا چھوٹا ہوا حصہ ادا کرنے کے بعد امام کی پیروی شروع کرتا تھا۔ پھر یہ طریقہ مقرر کیا گیا کہ جماعت میں جس مرحلے پر بھی آکر شریک ہو، امام کی پیروی میں نماز پڑھنی شروع کردو، پھر امام کے سلام پھیر دینے کے بعد اٹھ کر اپنی نماز پوری کرو۔ اسی طرح روزے کے احکام بھی بتدریج آئے ہیں۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو آپ ہر مہینے تین دن کے روزے رکھتے تھے، اور ایک روزہ محرم کی دسویں کو رکھا کرتے تھے۔ پھر اللہ نے رمضان کے روزے فرض کئے، مگر یہ رعایت رکھی کہ جو روزہ نہ رکھے وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ اس کے بعد حکم آیا کہ رمضان کے روزے ضرور رکھے جائیں اور تندرست مقیم آدمی کے لئے فدیے کی رعایت منسوخ کردی۔ پہلے لوگ افطار کے بعد بس اُس وقت تک کھانا پینا اور مباشرت کرنا جائز سمجھتے تھے جب تک کہ سو نہ جائیں۔ سونے کے بعد وہ سمجھتے تھے کہ دوسرے دن کا روزہ شروع ہوگیا۔ اگرچہ اس باب میں کوئی صریح حکم نہ تھا، مگر لوگ ایسا ہی سمجھے ہوتے تھے۔ بعد میں حکم آیا کہ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ الی قولہ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ۔ (ابن کثیر۔ ج ۱۔ ص ۲۱۴)

اس مضمون کی تائید میں بخاری، مسلم، ابو داؤد اور دوسرے محدثین نے متعدد روایات نقل کی ہیں جو حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ مشہور مفسر ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) نے پوری سند کے ساتھ جن صحابہ اور تابعین سے اس کی تائید میں روایات نقل کی ہیں ان کے نام یہ ہیں: معاذ بن جبلؓ۔ ابن عمرؓ۔ ابن عباسؓ۔ سلمہ بن اکوعؓ۔ علقمہ۔ عکرمہ۔ حسن بصری۔ شعبی۔ عطاء۔ زُہری۔ ان میں سے ایک روایت میں وہ حضرت معاذ بن جبل کی یہ تصریح

نقل کرتے ہیں کہ پہلے چونکہ اہلِ عرب روزوں کے عادی نہ تھے اور روزہ ان پر سخت گراں گزرتا تھا، اس لئے ان کو یہ رعایت دی گئی تھی کہ رمضان میں جس دن روزہ نہ رکھیں اس دن کسی مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ بعد میں تاکیدی حکم آگیا کہ پورے مہینے کے روزے رکھو، اِلّا یہ کہ تم مریض ہو، یا سفر پر ہو۔ ایک اور روایت میں وہ ابن عباس کی یہ تصریح نقل کرتے ہیں کہ پہلے سال کے روزوں میں اللہ تعالیٰ نے فدیے کی رخصت رکھی تھی، مگر دوسرے سال جو حکم آیا اس میں مریض و مسافر کی رعایت تو بحال تھی، لیکن مقیم کے لئے فدیے کی رعایت کا ذکر نہ تھا، اس لئے یہ رعایت منسوخ ہو گئی۔

اس تشریح سے ہر شخص خود اندازہ کر سکتا ہے کہ جو لوگ حدیث سے بے نیاز ہو کر، بلکہ احادیث کو حقارت اور تضحیک کے ساتھ پھینک کر، قرآن سے من مانے احکام نکال رہے ہیں وہ کس طرح خود گمراہ ہو رہے ہیں اور عام مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔

---

# رمضان میں قیام اللیل

براہ کرم مندرجہ ذیل سوالات کے جواب عنایت فرمائیں :-

**سوال :-**

۱۔ علمائے کرام بالعموم یہ کہتے ہیں کہ تراویح اوّل وقت میں (عشاء کی نماز کے بعد متصل) پڑھنا افضل ہے اور تراویح کی جماعت سنتِ مؤکدہ کفایہ ہے۔ یعنی اگر کسی محلہ میں تراویح باجماعت نہ ادا کی جائے تو اہل محلہ گنہ گار ہوں گے اور دو آدمیوں نے بھی مل کر مسجد میں تراویح پڑھ لی تو سب کے ذمہ سے ترکِ جماعت کا گناہ ساقط ہو جائے گا۔ کیا یہ صحیح ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں کیوں ایسا نہیں ہوا؟ اور اس زمانے کے مسلمانوں کے لئے کیا حکم ہو گا؟ کیا وہ سب تراویح باجماعت نہ پڑھنے کی وجہ سے گناہ گار تھے؟

۲۔ کیا نماز تراویح اوّل وقت میں سونے سے پہلے پڑھنا ضروری ہے؟ کیا سحری کے وقت تراویح پڑھنے والا افضلیت و اولویت سے محروم ہو جائے گا؟ اگر محروم ہو جائے گا تو حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے کہ التی تناموں عنہا افضل من التی تقومون؟

۳۔ کیا رمضان میں نماز تہجد سے تراویح افضل ہے؟ اگر ایک آدمی رمضان میں عشاء پڑھ کر سو رہے اور تراویح پڑھے بغیر رات کو تہجد پڑھے (جب کہ تہجد کے لئے خود قرآن مجید میں صراحتہً ترغیب دلائی گئی ہے اور تراویح کو یہ مقام حاصل نہیں)، تو اس کے لئے کوئی گناہ تو لازم نہ آئے گا؟

واضح رہے کہ تراویح اور تہجد دونوں کو نبھانا مشکل ہے۔

۴۔ کیا تراویح کے بعد وتر بھی جماعت سے پڑھنے چاہئیں؟ یا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تراویح سے پہلے وتر پڑھ لے اور رات کے آخری حصے میں تراویح ادا کر لے؟

۵۔ تراویح کی تعدادِ رکعت کیا ہے؟ کیا صحیح احادیث میں آٹھ، بیس، اڑتیس یا چالیس رکعتیں نبی صلعم سے ثابت ہیں؟

۶۔ کیا کسی صحابی کو یہ حق حاصل ہے کہ نبی صلعم جس چیز کو یہ کہہ کر رد کر دیں کہ "مازال بکم الذی رأیت من صنیعکم خشیت ان یکتب علیکم ولو کتب علیکم ما قمتم به فصلوا ایها الناس فی بیوتکم فان افضل صلوۃ المرء فی بیته الا الصلوۃ المکتوبه" تو وہ اسے پھر باقاعدہ جماعت کے ساتھ مساجد میں جاری کرے؟

جواب:

تراویح کے بارے میں جو کچھ مجھے معلوم ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلّم دوسرے زمانوں کی نسبت رمضان کے زمانے میں قیامِ لیل کے لئے زیادہ ترغیب دیا کرتے تھے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز آپ کو بہت محبوب تھی۔

(۲) صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حضورؐ نے ایک مرتبہ رمضان المبارک میں تین رات نماز تراویح جماعت کے ساتھ پڑھائی اور پھر یہ فرما کر اسے چھوڑ دیا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ تم پر فرض نہ ہو جائے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تراویح میں جماعت مسنون ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تراویح فرض کے درجہ میں نہیں ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ چاہتے تھے کہ لوگ ایک پسندیدہ سنت کے طور پر تراویح پڑھتے رہیں مگر بالکل فرض کی طرح لازم نہ سمجھ لیں۔

(۳) تمام روایات کو جمع کرنے سے جو چیز حقیقت سے قریب تر معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضورؐ نے خود جماعت کے ساتھ رمضان میں جو نماز پڑھائی وہ اوّل وقت تھی نہ کہ آخر وقت ہیں۔ اور وہ آٹھ رکعتیں تھیں نہ کہ بیس (اگرچہ ایک روایت بیس کی بھی ہے مگر وہ آٹھ رکعت والی روایت کی بہ نسبت ضعیف ہے) اور یہ کہ لوگ حضورؐ کے پیچھے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے بعد واپس جا کر اپنے طور پر مزید کچھ رکعتیں بھی پڑھتے تھے وہ مزید رکعتیں کتنی ہوتی تھیں؟ اس کے بارے میں کوئی واضح بات نہیں ملتی۔ لیکن بعد میں جو حضرت عمرؓ نے ۲۰ رکعتیں پڑھنے کا طریقہ رائج کیا اور تمام صحابہ نے اس سے اتفاق کیا اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ زائد رکعتیں ۱۲ ہوتی تھیں۔

(۴) حضورؐ کے زمانہ سے لے کر حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانہ تک باقاعدہ ایک جماعت میں سب لوگوں کے تراویح پڑھنے کا طریقہ رائج نہ تھا، بلکہ لوگ یا تو اپنے اپنے گھروں میں پڑھتے تھے یا مسجدیں متفرق طور پر چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی شکل میں پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ اسی تفرق کو دور کر کے سب لوگوں کو ایک جماعت کی شکل میں نماز پڑھنے کا حکم دے دیا۔ اس کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس یہ حجت موجود تھی کہ حضورؐ نے خود تین بار جماعت کے ساتھ تراویح پڑھائی تھی۔ اس لئے اس فعل کو بدعت نہیں کہا جا سکتا۔ اور چونکہ حضورؐ نے اس سلسلہ کو یہ فرما کر بند کیا تھا کہ کہیں یہ فرض نہ ہو جائے اور حضورؐ کے گزر جانے کے بعد اس امر کا اندیشہ باقی نہ رہا تھا کہ کسی کے فعل سے یہ چیز فرض قرار پا سکے گی، اس لئے حضرت عمرؓ نے ایک سنت اور مندوب چیز کی حیثیت سے اس کو جاری کر دیا۔ یہ حضرت عمرؓ کے تفقہ کی بہترین مثالوں میں سے ایک ہے کہ انہوں نے شارع کے منشاء کو ٹھیک ٹھیک سمجھا اور امت میں ایک صحیح طریقہ

کو رائج فرمادیا۔ صحابۂ کرام میں سے کسی کا اس پر اعتراض نہ کرنا، بلکہ بسر و چشم اسے قبول کر لینا یہ ثابت کرتا ہے کہ شارع کے اس منشا کو صحابۂ کرام بھی اسی طرح سمجھتے تھے جیسا حضرت عمرؓ نے سمجھا۔ پھر حضرت عمرؓ نے شارع کے اس منشا کو بھی ٹھیک ٹھیک پورا کیا کہ "اسے فرض کے درجہ میں نہ کر دیا جائے"۔ چنانچہ کم از کم ایک بار تو ان کا خود تراویح میں شریک نہ ہونا ثابت ہے جب کہ وہ عبدالرحمان بن عبد کے ساتھ نکلے اور مسجد میں لوگوں کو تراویح پڑھتے دیکھ کر اظہار تحسین فرمایا۔

(۵) حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب باقاعدہ جماعت کے ساتھ تراویح پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا تو باتفاق صحابہ بیس رکعتیں پڑھی جاتی تھیں اور اسی کی پیروی حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانہ میں بھی ہوئی۔ تینوں خلفاء کا اس پر اتفاق اور پھر صحابہ کا اس میں اختلاف نہ کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لوگ تراویح کی بیس ہی رکعتوں کے عادی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، اور امام احمد تینوں ۲۰ ہی رکعت کے قائل ہیں، اور ایک قول امام مالک کا بھی اسی کے حق میں ہے۔ داؤد ظاہری نے بھی اسی کو سنتِ ثابتہ تسلیم کیا ہے۔

(۶) حضرت عمر بن عبدالعزیز اور حضرت ابان بن عثمان نے ۲۰ کے بجائے ۳۶ رکعتیں پڑھنے کا جو طریقہ شروع کیا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ان کی تحقیق خلفاء راشدین کی تحقیق کے خلاف تھی بلکہ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ مکہ سے باہر کے لوگ ثواب میں اہل مکہ کے برابر ہو جائیں۔ اہل مکہ کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ تراویح کی ہر چار رکعتوں کے بعد کعبے کا طواف کرتے تھے۔ ان دونوں بزرگوں نے ہر طواف کے بدلے چار رکعتیں پڑھنی شروع کر دیں۔ یہ طریقہ چونکہ اہل مدینہ میں رائج تھا اور امام مالک اہل مدینہ کے عمل کو سند سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے بعد میں ۲۰ کے بجائے ۳۶ کے حق میں فتوے دیا۔

(۷) علماء جس بنا پر یہ کہتے ہیں کہ جس بستی یا محلہ میں سرے سے نماز تراویح با جماعت ادا ہی نہ کی جائے اس کے سب لوگ گناہ گار ہیں وہ یہ ہے کہ تراویح ایک سنت الاسلام ہے جو عہد خلافت راشدہ سے تمام امت میں جاری ہے۔ ایسے ایک اسلامی طریقہ کو چھوڑ دینا اور بستی کے سارے ہی مسلمانوں کا مل کر چھوڑ دینا، دین سے ایک عام بے پروائی کی علامت ہے جس کو اگر گوارا کر لیا جائے تو رفتہ رفتہ وہاں

سے تمام اسلامی طریقوں کے مٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ اس پر جو معارضہ آپ نے کیا ہے اس کا جواب اوپر نمبر ۳ میں گزر چکا ہے۔

(۸) اس امر میں اختلاف ہے کہ تراویح کے لئے افضل وقت کونسا ہے، عشا کا وقت یا تہجد کا؟ دلائل دونوں کے حق میں ہیں، مگر زیادہ تر رجحان آخر وقت ہی کی طرف ہے۔ البتہ اول وقت کی ترجیح کے لئے یہ بات بہت وزنی ہے کہ مسلمان بحیثیت مجموعی اوّل وقت ہی کی تراویح پڑھ سکتے ہیں۔ آخر وقت اختیار کرنے کی صورت میں امت کے سوادِ اعظم کا اس ثواب سے محروم رہ جانا ایک بڑا نقصان ہے۔ اور اگر چند صلحاء آخر وقت کی فضیلت سے مستفید ہونے کی خاطر اوّل وقت کی جماعت میں شریک نہ ہوں تو اس سے یہ اندیشہ ہے کہ عوام الناس یا تو اُن صلحاء سے بدگمان ہوں، یا ان کی عدم شرکت کی وجہ سے خود ہی تراویح چھوڑ بیٹھیں۔ یا پھر ان صلحاء کو اپنی تہجد خوانی کا ڈھنڈورا پیٹنے پر مجبور ہونا پڑے۔

ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ وھو اعلم بالصواب۔

---

## چند متفرق سوالات

مندرجہ ذیل استفسارات کے جواب لکھنے کی تکلیف دے رہا ہوں:۔

**سوال:**

۱۔ آیت - یدبر الامر من السماء الی الارض ثم یعرج الیہ فی یوم کان مقدارہ الف سنۃ مما تعدون (السجدۃ آیت: ۵) کا مفہوم میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس وقت میرے سامنے صرف تفسیر کشاف ہے۔ صاحب کشاف کی توجیہات سے مجھے اتفاق نہیں ہے کیونکہ قرآنی الفاظ ان توجیہات کی تصدیق نہیں کرتے۔ ان پر تبصرہ لکھ کر آپ کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ آپ کے نزدیک اس آیت کا صحیح مطلب کیا ہے؟ لفظ یعرج الیہ کا لغوی مدلول پیش نظر رہنا چاہیے۔ نیز یہ لفظ الامر قرآن کی اصطلاح میں

کن کن معنوں میں مستعمل ہوتا ہے؟

۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ولقد خلقنا الانسان من سلٰلۃ من طین ۝ ثم جعلناہ نطفۃ فی قرار مکین ۝ ثم خلقنا النطفۃ علقۃ فخلقنا العلقۃ مضغۃ فخلقنا المضغۃ عظاماً فکسونا العظام لحماً ثم انشأناہ خلقاً اٰخر فتبارک اللہ احسن الخالقین (المؤمنون ۱۲ تا ۱۴) کی تشریح کرتے ہوئے علم الجنین کے جن مدارج ستہ کو قرآنی الفاظ کے ساتھ چسپاں کیا ہے اُس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے۔ مولانا کے علم و فضل کی عظمت کے اعتراف کے باوجود مجھے اس بات کے اظہار کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ صحابہ کرام و سلف صالحین میں سے کسی نے بھی ان مدارج ستہ کو بیان نہیں کیا ہے۔ ممکن ہے میں غلط فہمی کی بنا پر کہہ رہا ہوں، آپ اس مقام کا بغور مطالعہ کر کے اس "تحقیق جدید" کے بارہ میں اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔ نیز اگر آپ کو مولانا کی اس تشریح سے اختلاف ہو تو پھر فرمایئے کہ آپ کے نزدیک اس آیت کا مطلب کیا ہے اور قدیم تفسیر پر مولانا نے جو اعتراضات کئے ہیں آپ کے پاس ان کا کیا جواب ہے؟

(ملاحظہ ہو ترجمان القرآن ج ۲ ص ۵۴۰ ، ۵۴۴)

۳۔ مفردات القرآن (امام راغب) اور اساس البلاغۃ (زمخشری) کے بارہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟ قرآن سمجھنے کے لئے اگر کوئی لغت کی مفید و مستند کتاب معلوم ہو تو مطلع فرمایئے۔

۴۔ اسلامی شریعت میں مردوں کے لئے سونے چاندی کا استعمال ممنوع ہے۔ کیا سونے یا چاندی کا پاندان اس ممانعت کی زد میں آسکتا ہے؟ اور گھڑی کے بعض حصوں میں سونے کے استعمال کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟

۵۔ امریکن سوپ فیکٹری رحیم یار خاں کے انگریز منیجر نے صابون کے اجزائے ترکیبی پر بحث کرتے ہوئے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ یورپ سے آنے والے خوشبودار سوپ میں

چربی کا استعمال ناگزیر ہوتا ہے ہر قسم کے جانور کی چربی کو استعمال کیا جاتا ہے خواہ وہ خنزیر ہو یا گائے۔ اس انکشاف جدید کے بعد میں نے لکس، حمام وغیرہ کا استعمال ترک کر دیا ہے۔ اس مسئلہ میں آپ کی رائے کیا ہے؟ کیا آپ انگریزی خوشبو دار سوپ استعمال کرتے ہیں؟

جواب:-

(۱) آیت یدبر الامر من السماء الی الارض متشابہات کے قبیل سے ہے۔ اس کا مجمل مفہوم تو سمجھ میں آسکتا ہے، مگر تفصیلی مفہوم متعین کرنا مشکل ہے، کیونکہ ہمارے پاس اس کے لئے کوئی ذریعہ علم نہیں ہے۔ مجملاً جو کچھ سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ زمین کی تدبیر صرف زمین ہی پر نہیں ہو رہی ہے بلکہ وہ ہستی اس انتظام کو چلا رہی ہے جو سارے جہانِ وجود کی ناظم و مدبر ہے۔ اس تدبیر کا سر رشتہ عالم بالا میں ہے جہاں زمین اور اس کے مختلف النوع معاملات سے متعلق ایک منصوبہ تیار ہوتا ہے، کارکنان قضاء و قدر اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے پر مامور ہوتے ہیں، اور پھر وقتاً فوقتاً اس کے ہر مرحلے کی تکمیل پر اپنی رپورٹ اوپر بھیجتے یا پیش کرتے ہیں۔ اس منصوبے میں ایک ایک مرحلے کی اسکیم بسا اوقات ایک ایک ہزار سال اور پچاس پچاس ہزار سال کی ہوتی ہے۔ ہمارے لئے وہ ایک مدت دراز ہے، مگر مدبر کائنات کے ہاں وہ گویا ایک دن کا کام ہے۔

یعرج الیہ کے لغوی مدلول کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کا مطلب میری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ اس سے مراد کارکنان قضا و قدر کا اپنے کام کی رپورٹ لے کر پیشی خداوندی میں جانا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ کام جو پہلے اسکیم کی حیثیت سے ان کے سپرد کیا گیا تھا پایۂ تکمیل کو پہنچنے پر روداد کی شکل میں اوپر (Fovwarb) کیا جاتا ہے۔

الامر سے مراد ایسے مواقع پر "کائنات کا انتظام" ہوا کرتا ہے۔

(۲) آیت لقد خلقنا الانسان من سللۃ من طین کی جو تشریح مولانا ابوالکلام نے کی ہے اس کا بیشتر حصہ صحیح ہے۔ ایسے معاملات میں قدیم مفسرین سے اختلاف کرنا قابل اعتراض نہیں ہے۔ ظاہر

ہے کہ علم الاشیا کے متعلق انسان کی واقفیت جتنی بڑھے گی قرآن کے اس طرح کے بیانات کا مطلب پہلے سے زیادہ صحیح طریقے سے سمجھ میں آتا چلا جائے گا۔ یہ کوئی احکام شرعیہ، یا امور اعتقادیہ نہیں ہیں جن میں سلف کا فہم زیادہ معتبر ہو۔ البتہ اُن کا وہ حصہ لائق اعتماد نہیں ہے جس میں انہوں نے اس آیت کا رشتہ بھی ڈارونی نظریہ ارتقار سے جوڑ دیا ہے۔ وہ ڈارونیت کے دلائل سے اس قدر مرعوب ہیں کہ علم جنین کے جو حقائق دراصل اس نظریہ کی تردید کر رہے ہیں انہی کو وہ اس کے شواہد میں شمار کرتے ہیں۔

(۳) مفردات امام راغب اور اساس البلاغۃ قرآن کو سمجھنے میں ایک حد تک مدد تو ضرور دیتی ہیں لیکن بسا اوقات ان سے غلط تاویلات کے رستے پر بھی آدمی پڑ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن کی تاویل میں خود اپنا ایک مسلک رکھتے ہیں اور لغت کی تحقیق میں اپنے مسلک کے نظریات بھی داخل کر دیتے ہیں۔ اس لئے جن لوگوں کا منبع علم انہی کتابوں تک محدود ہے وہ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ایک لفظ کی لغوی تشریح وہی کچھ ہے جو راغب اور زمخشری نے بیان کر دی ہے۔ میرے نزدیک اس کے بجائے لسان العرب، تاج العروس، نہایہ ابن اثیر، قاموس، جمہرۃ ابن درید اور ابن جریر کی لغوی تحقیقات زیادہ لائق اعتماد ہیں، کیونکہ یہ لوگ لغت میں خالص لغت سے بحث کرتے ہیں، اپنے نظریات کو دخل نہیں دیتے۔

(۴) سونے چاندی کا صرف پہننا ہی ممنوع نہیں ہے بلکہ ان کے برتن استعمال کرنا بھی ممنوع ہے۔ اس لئے ان کے پاندان کے جائز ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ رہی گھڑی، تو اس کے اندر کسی پرزے میں سونا لگایا گیا ہو تو وہ جائز ہو سکتا ہے۔ مگر باہر بطور زینت جو سونا چاندی استعمال کیا گیا ہو وہ جائز نہیں ہے۔

(۵) یہ امر تحقیق طلب ہے کہ حرام چیزیں کیمیاوی ترکیبات میں شامل ہو جانے کے بعد بھی آیا اپنی اصل کو باقی رکھتی ہیں یا نہیں؟ اور اگر یہ اصل باقی نہیں رہتی بلکہ کیمیاوی ترکیب ان کی ماہیت تبدیل کر کے ان کو اور ان کے ساتھ ملنے والی دوسری اشیا کو بھی ایک نئی چیز بنا دیتی ہے، تو کیا وہ نئی چیز بھی اس بنا پر حرام ہو گی کہ اس کے اجزار ترکیبی میں ایک حرام شے شامل تھی؟ یہ ایک دقیق مسئلہ ہے جس کو حل کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ پہلے مجرد ترکیب۔ اختلاط، آمیزش اور امتزاج کی نوعیت اور کیمیاوی ترکیب و تحول کی نوعیت کا فرق اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ نیز یہ بات بھی سمجھ لی جائے کہ کیمیاوی ترکیب سے اجزار ترکیب کی انفرادی ماہیتوں میں جو تغیرات

واقع ہوتے ہیں وہ اُن تغیرات سے اشبہ ہیں جو نباتات اور حیوانات کے جرم میں اجزاء غذا کے داخل ہونے کے بعد واقع ہوا کرتے ہیں۔

مسئلے کے اس پہلو کو ذہن نشین کر لینے کے بعد پہلے ماہرین فن سے یہ پوچھنا ضروری ہے کہ آیا صابن میں مجرد ترکیب واقع ہوتی ہے یا کیمیاوی ترکیب، یعنی آیا اس کے اجزاء کا اختلاط محض آمیزش کی نوعیت رکھتا ہے جس میں ایک ایک جز اپنی اصل باقی رکھتا ہو، یا یہ سب مل کر ایک کیمیاوی عمل کی بدولت اپنی ابتدائی ماہیت کھو دیتے ہیں اور ایک نئی چیز پیدا کرتے ہیں؟

اس کے بعد علماء کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ جو ترکیبات مؤخر الذکر نوعیت کی ہوں ان میں حرام اجزاء کی شمولیت کا کیا حکم ہے؟

اس تحقیق کی ضرورت خاص طور پر اس وجہ سے بہت شدید ہو گئی ہے کہ ہمارا ملک زیادہ تر خام اشیا پیدا کر کے بیچ دیتا ہے اور ہم ان کے بدلے میں ایسے ملکوں سے اپنی ضروریات کی بے شمار مصنوعات خرید رہے ہیں جہاں کے لوگ حرام و حلال کی تمیز سے قطعاً نا آشنا ہیں۔ اب یہ بات وقتاً فوقتاً ہمارے علم میں آتی رہتی ہے کہ فلاں چیز جو باہر سے درآمد ہوتی ہے اس میں فلاں حرام شے استعمال کی جاتی ہے، اور اس طرح کی خبریں سُن سُن کر آئے دن ہماری زندگی تلخ ہوتی رہتی ہے کہ کہیں ہم گناہ میں تو مبتلا نہیں ہو رہے ہیں۔ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ پہلے اصولی طور پر مختلف اقسام کے مرکبات کی شرعی حیثیت مشخص کی جاتے اور پھر ہر ایک کا حکم واضح طور پر بتا دیا جائے۔

مَیں اس معاملہ میں خود مذبذب ہوں اور قطعی رائے پر نہیں پہنچ سکا ہوں۔ البتہ اس پریشانی میں سب کے ساتھ شریک ہوں کہ وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی چیز کے متعلق یہ اطلاع کانوں میں پڑ جاتی ہے کہ اس میں کوئی حرام چیز شامل ہے۔ اب آپ نے صابن کے متعلق خبر سُنا کر ایک اور شک کا اضافہ کر دیا۔

---

# "قتل مرتد" کے مسئلے پر ایک اعتراض

سوال: (۱) اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ..... الخ (سورۂ نساء) کی

تشریح کے سلسلے میں ایک میرزائی دوست نے یہ اعتراض اٹھایا ہے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے "قتلِ مرتد" میں یہ تحریر کیا ہے کہ جو ایک دفعہ اسلام لا کر اس سے پھر جائے، اسلام نے اس کے قتل کا حکم دیا ہے۔ لیکن قرآن میں دوسری دفعہ ایمان لانا مندرجہ بالا آیت سے ثابت ہے۔ براہِ کرم یہ اشکال رفع فرمائیں۔

(۲) اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ ..... الخ (سورۂ نور) کا مفہوم کیا ہے؟

(۳) فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ ...... الخ (سورۂ انعام) کی تشریح بھی مطلوب ہے۔

جواب:

آیت اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا سے قتلِ مرتد کے مسئلے پر آپ کے قادیانی دوست نے جو اعتراض کیا ہے، وہ ان کی کم فہمی کا نتیجہ ہے۔ انہیں معلوم نہیں کہ قتلِ مرتد کا حکم تو اسی جگہ نافذ ہو سکتا ہے جہاں اسلامی حکومت موجود ہو، مگر مسلمان ان مقامات پر بھی پایا جا سکتا ہے جہاں نہ اسلام کی حکومت ہو، نہ ارتداد کی سزا دینی ممکن ہو۔ اس لئے آیت مذکورہ سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن کی رو سے تمام حالتوں میں کفر بعد الاسلام کے بار بار ارتکاب کا امکان ثابت ہوتا ہے جو قانون قتلِ مرتد نافذ ہونے کی صورت میں ناقابلِ تصور ہے۔ پھر آپ کے ان قادیانی دوست کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اسلامی قانون حدِ ارتداد کے بعد فوراً ہی مرتد کو قتل کر دینے کا حکم نہیں دیتا، بلکہ اس کو اپنی غلطی محسوس کرنے اور توبہ کرنے کا موقع بھی دیتا ہے اور اگر وہ توبہ کر لے تو اسے معاف کر دیتا ہے۔ علاوہ بریں انہوں نے اس بات پر بھی غور نہیں کیا کہ یہ آیت ارتداد کی اُخروی سزا بیان کر رہی ہے۔ اور کسی جرم کا اخروی نتیجہ بیان کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے لئے کوئی دنیوی سزا نہ ہونی چاہیے۔ جن گناہوں کی سزا قرآن میں بیان کی گئی ہے، ان میں سے متعدد ایسے ہیں جن کی دنیوی سزا کے علاوہ اخروی سزا کا بھی ذکر کیا گیا ہے، مثلاً مسلمان کو عمداً قتل کرنا۔ اس لئے کہ بکثرت حالات ایسے ہو سکتے ہیں اور رونما ہوتے رہتے ہیں جن میں ایک شخص ارتکابِ جرم کرتا ہے اور دنیوی سزا سے بچا رہتا ہے۔ اسی

ارتداد کے معاملہ میں دیکھئے کہ اس کی دنیوی سزا صرف اس وقت دی جاسکتی ہے جب کہ آدمی کا ارتداد علانیہ ہو، حکومت کے نوٹس میں آجائے، اور عدالت میں اس کا ثبوت بہم پہنچ جائے۔ مگر بکثرت ارتداد ایسے بھی ہوسکتے ہیں جو مخفی طور پر واقع ہوں، اور بار بار توبہ کرنے کے بعد آدمی پھر کفر میں مبتلا ہوتا رہے۔ لہٰذا دنیوی سزا قانون میں تجویز کر دینے کے باوجود اخروی سزا کا ذکر ضروری ہے، اور کسی مقام پر محض اخروی سزا مذکور ہونے کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ اس جرم کے لئے دنیوی سزا نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں میرے لئے یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ "مرتد کی سزا" کا نام سنتے ہی قادیانی حضرات آخر کیوں اس قدر پریشان ہو جاتے ہیں؟ میں نے اپنی کتاب میں کہیں بھولے سے اشارۃً تک ان کی طرف نہیں کیا ہے۔ پھر بھی وہ اس پر اتنے مشتعل ہیں کہ گویا انہی کے لئے سزائے موت تجویز کی گئی ہے۔ کیا وہ خود اپنے متعلق کسی شبہ میں پڑے ہوئے ہیں؟

آیت الخبیثٰت للخبیثین سے مراد یہ ہے کہ بدکار مردوں کے لئے بدکار عورتیں ہی موزوں ہیں، اور بدکار عورتوں کے لئے بدکار مرد ہی موزوں ہیں۔ پرہیزگار اہلِ ایمان کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے لوگوں سے رشتے جوڑیں۔

آیت فلما جن علیہ اللیل کی تفسیر کے لئے تفہیم القرآن ملاحظہ کیجئے۔ سورۂ انعام کی تفسیر میں اس آیت پر مفصل کلام کیا گیا ہے۔

---

## اختلاف کے جائز حدود

**سوال:**

تحریک کا ہمدرد ہونے کی حیثیت سے اس کے لٹریچر اور جرائد و اخبارات کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ اب تک بزرگانِ دیوبند اور دوسرے علماء کی طرف سے جو فتوے شائع ہوتے رہے ہیں اور ان کے جو جوابات امیر جماعت ہند و امیر جماعتِ پاکستان و دیگر ارکین جماعت کی طرف سے دیئے

گئے ہیں، سب کو بالالتزام پڑھتا رہا ہوں۔ اپنے بزرگوں کی اس حالت کو دیکھ کر بہت صدمہ ہوتا ہے مگر سوائے افسوس کے اور چارہ کوئی نظر نہیں آتا۔

ان فتووں کو دیکھ کر یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ تکفیر و تفسیق کا معاملہ جماعت اسلامی اور بزرگان دیوبند ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ جب ہم اسلافِ کرام و ائمۂ عظام کی سیرتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم ان بزرگوں کی سیرتوں میں بھی اس مسئلے کو مختلف فیہ پاتے ہیں۔ مثلاً ایک گروہ میں امام ابن تیمیہؒ، امام ابنِ حزمؒ اندلسی، امام ابن جوزیؒ وغیرہم اکابر ہیں، دوسرے گروہ میں امام ابنِ عربیؒ، امام غزالیؒ، امام ولی اللہؒ جیسے بزرگ ہیں۔ ان میں سے پہلا گروہ کہتا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کا مطلب "لا معبود الا اللہ" ہے، دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس کا مطلب "لا موجود الا اللہ" ہے۔ پہلا گروہ دوسرے گروہ کے اس عقیدے کو کفر و الحاد کہتا ہے، دوسرا گروہ اپنے اس عقیدے کو توحید کا اعلیٰ و اکمل درجہ تصور کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کلمہ جس کی تشریح کے لیے قرآن نازل کیا گیا اسی کے متعلق علمائے امت و ائمۂ وقت کا یہ اختلاف کیسا ہے؟

امید ہے کہ آپ اس مسئلے پر ترجمان القرآن میں مفصل بحث فرمائیں گے!

**جواب:۔**

کسی مفصل بحث کے بجائے آپ کی تشفی کے لیے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ قرآن مجید اپنے مدعا کو بغیر کسی ابہام کے صاف صاف بیان کرتا ہے، اور اس نے کسی ایسی حقیقت کو جس کا جاننا آدمی کی ہدایت کے لیے ضروری تھا، واضح کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔ مگر اختلافات پیش آنے کے دو بڑے اسباب ہیں:۔

ایک یہ کہ جب لوگ کسی قرآنی حقیقت کی اپنے الفاظ میں تعبیر کرتے ہیں، اور قرآن کی حدود سے آگے بڑھ کر اپنی تشریحات پیش کرتے ہیں تو رائے کے اختلافات، اور بسا اوقات سخت اختلافات کی گنجائش نکل آتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ جب لوگ اپنے آپ کو ایسے سوالات کا جواب دینے کا مکلف سمجھتے ہیں جن کی تکلیف خدا و رسول نے ان کو نہیں دی تھی تو جھگڑوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

اس پر بھی بات نہ بڑھے، اگر ایک شخص اپنے بیان پر اور دوسرا اس کی تردید پر قناعت کرے۔ لیکن پہلے بھی بارہا ایسا ہوا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے کہ ایک شخص اپنی بات کہنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اسے عین قرآن کی بات اور اس کے منکر کو صراحۃً یا کنایۃً قرآن کا منکر ٹھیرا دیتا ہے، اور دوسرا شخص اس کی تردید پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ اسے ضالّ و مضل، اور بسا اوقات کافر تک ٹھیرا دیتا ہے۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر ہر ایک کے متبعین اپنے اپنے پیشوا کی بات کی پچ کرتے ہیں اور مزید تشدد برتنے لگتے ہیں۔ ان طریقوں سے مختلف فرقوں کی بنا پڑ جاتی ہے اور ہر ایک دوسرے سے نماز اور مسجد اور شادی بیاہ تک کے تعلقات توڑ لیتا ہے، اور اپنے مخصوص مسائل پر کفر و ایمان کی بنا رکھ دیتا ہے۔

یہ ہے خرابی کا اصل سبب، ورنہ اگر نص کو نص کی جگہ رہنے دیا جائے اور تعبیر و تشریح و استنباط کو مثلِ نص نہ بنایا جائے، اور بحث کو صرف اختلافِ رائے کی حد تک ہی رہنے دیا جائے تو اکثر خرابیاں سرے سے رونما نہ ہوں، اور نہ وہ سوالات پیدا ہوں جن پر آپ نے پریشانی کا اظہار کیا ہے۔

جن بزرگوں کے آپ نے نام لیے ہیں، اور جن کے نام نہیں لیے ہیں اُن کے درمیان جن مسائل میں اختلافات، اور شدید اختلافات ہوئے ہیں ان میں سے اکثر مسائل پر مَیں بھی اپنی ایک رائے رکھتا ہوں، اور لامحالہ میری رائے اُن میں سے بعض کے موافق اور بعض کے خلاف ہے۔ مگر مَیں صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہنے پر ٹھیر جاتا ہوں، اِس سے آگے بڑھ کر اُن لوگوں پر کوئی حکم چسپاں نہیں کرتا جن کی رائے سے مَیں نے اختلاف کیا ہے، اور نہ بحث کا یہ طریقہ اختیار کرتا ہوں کہ "میرے نزدیک فلاں شخص کی فلاں بات سے یہ لازم آتا ہے اور یہ کفر یا فسق یا ضلالت ہے، لہٰذا فلاں شخص ضالّ اور مضل یا کافر یا فاسق ہے"۔ اس طرح کے حکم لگانے کو میں حق سے تجاوز سمجھتا ہوں، کیونکہ ہماری منطق کے رُو سے اگر کسی شخص کے کسی قول سے ایک بُری بات لازم آتی ہو تو ہم اسے یہ الزام نہیں دے سکتے کہ اس "لازم" کا بھی وہ التزام کرتا ہے، اس لئے اُسے اِس کا ملتزم ٹھیرا کر اس پر وہ حکم لگانا جو اس بُری بات کے ملتزم ہی پر لگایا جا سکتا ہو کسی طرح جائز نہیں۔

---

# نمائش فقر کا مطالبہ

سوال:

آپ حضرات موجودہ برسرِ اقتدار طبقہ، اور امرا پر سخت تنقید کرتے ہیں، اس بنا پر کہ وہ زبان سے تو "اسلام اسلام" پکارتے ہیں، عوام اور غربا کی ہمدردی کا راگ الاپتے ہیں، مگر ان کے اعمال ان کے اقوال سے سراسر مختلف ہیں۔ لہٰذا خود آپ حضرات کے لیے تو یہ اشد ضروری ہے کہ (جب کہ آپ ایک اسلامی سوسائٹی برپا کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں) آپ کے اقوال و افعال میں کامل یکسانیت ہو۔ ورنہ آپ کی تنقید موجودہ امرا اور برسرِ اقتدار طبقہ پر بے معنی ہے۔

مَیں جانتا ہوں کہ اسلام اِس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ہم اپنی جائز کمائی سے اپنے آرام و آسائش کے سامان مہیا کریں، اچھی غذائیں کھائیں مگر کیا ایک ایسی سوسائٹی میں جہاں ہر طرف بھوک اور افلاس ہو، غریبی اور بے چارگی ہو، خصوصاً ایک داعی کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ اچھے ملبوسات استعمال کرے، عمدہ غذائیں کھائے اور ایک پُرتکلف زندگی گذارے؟ کیا رسول اللہ صلعم اور آپؐ کے صحابہ کی یہی روش تھی جب کہ وہ اسلامی تحریک کو پھیلانے میں مصروف تھے؟ آپ کے بعض ارکان کی ایک حد تک تعیشانہ (Luxurious) طرزِ زندگی کو دیکھ کر میرے اندر یہ سوال پیدا ہوا ہے۔

براہ کرم میرے ذہنی خلجان کو دور کر دیں۔

جواب:

مجھے نہیں معلوم کہ آپ نے جماعت کے کن لوگوں کو دیکھا ہے اور ان کی زندگی میں کیا چیز آپ کو تعیشانہ (Luxurious) نظر آتی ہے۔ اس لیے آپ کے سوالات کا جواب دینا میرے لئے مشکل ہے، جب تک کہ آپ کسی شخص کا اور اس تعیش (Luxury) کا تعین نہ فرمائیں جو آپ نے اس کی زندگی میں دیکھا ہے!

رہا صحابۂ کرام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگیوں کا معاملہ، جن کا آپ نے حوالہ دیا ہے، تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انہوں نے کبھی اپنی زندگی میں مصنوعی درویشی پیدا کرنے کی کوشش نہیں فرمائی، اور نہ محض اس غرض سے اپنے لباس، مکان اور خوراک کا معیار کمتر رکھا کہ دیکھنے والے ان کی فقیرانہ شان دیکھ کر داد دیں۔ وہ سب بالکل ایک فطری، سادہ اور معتدل زندگی بسر کرتے تھے، اور جس اصول کے پابند تھے وہ صرف یہ تھا کہ شریعت کے ممنوعات سے پرہیز کریں، مباحات کے دائرے میں زندگی کو محدود رکھیں، رزق حلال حاصل کریں اور راہِ خدا کی جدوجہد میں بہرحال ثابت قدم رہیں، خواہ اس میں فقر و فاقہ پیش آئے، یا اللہ کسی وقت اپنی نعمتوں سے نواز دے! جان بوجھ کر بُرا پہننا جب کہ اچھا پہننے کو جائز طریق سے مل سکے، اور جان بوجھ کر بُرا کھانا جب کہ اچھی غذا حلال طریقے سے بہم پہنچ سکے، ان کا مسلک نہ تھا۔ ان میں سے جن بزرگوں کو راہِ خدا میں جدوجہد کرنے کے ساتھ حلال روزی فراخی کے ساتھ مل جاتی تھی وہ اچھا کھاتے بھی تھے، اچھا پہنتے بھی تھے اور پختہ مکانوں میں رہتے بھی تھے۔ خوشحال آدمیوں کا قصداً بدحال بن کر رہنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی پسند نہیں فرمایا، بلکہ آپ نے خود ان کو یہ بتایا کہ اللہ تعالٰی اپنی نعمت کا اثر تمہارے لباس اور کھانے اور سواری میں دیکھنا پسند فرماتا ہے۔

میری سمجھ میں کبھی ان لوگوں کی ذہنیت نہیں آسکی جو خود اپنے لیے تو اللہ کی ساری نعمتوں کو مباح سمجھتے ہیں اور دوسرے کسی شخص کا بھی اچھا کھانا اور اچھا پہننا ان کی نگاہوں میں نہیں کھٹکتا، مگر جہاں کسی نے اللہ کے دین کی خدمت کا نام لیا، پھر اس کا سادہ لباس اور سادہ کھانا اور معمولی درجے کا مکان اور فرنیچر بھی انکی نگاہوں میں کھٹکنے لگتا ہے اور ان کا دل یہ چاہنے لگتا ہے کہ ایسے شخص کو زیادہ سے زیادہ بدحال دیکھیں۔ شاید لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کی نعمتیں صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جو خدا کا کام کرنے کے بجائے اپنا کام کرتے رہیں۔ رہے خدا کا کام کرنے والے، تو وہ خدا کی کسی نعمت کے مستحق نہیں ہیں۔ یا پھر شاید ان کے دماغ پر راہبوں اور سنیاسیوں کی زندگی کا سکہ بیٹھا ہوا ہے اور وہ دینداری کے ساتھ رہبانیت کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں، اس لیے کھاتا پیتا دیندار ان کو ایک اعجوبہ نظر آتا ہے۔

اگرچہ جماعت کے بہت سے لوگ اس ذہنیت کے اعتراضات کے ہدف بنے رہتے ہیں، لیکن سب

سے بڑھ کر میری ذات ان کا نشانہ بنتی ہے۔ حالانکہ میرا نقطۂ نظر اس معاملے میں معترضین کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے۔ میرے نزدیک ہر وہ جائز سہولت جو آدمی کو دین کا کام بہتر اور زیادہ مقدار میں انجام دینے کے قابل بنائے نہ صرف جائز ہے بلکہ اس سے فائدہ اٹھانا افضل ہے اور اسے ترک کر دینا نہ صرف ایک حماقت ہے بلکہ اگر وہ اظہارِ درویشی کی نیت سے ہو تو ریاکاری بھی ہے۔ آپ خود غور کریں کہ ایک شخص اگر موٹر استعمال کر کے کم وقت میں زیادہ کام کر سکتا ہو تو وہ کیوں اسے استعمال نہ کرے؟ اگر وہ سیکنڈ کلاس میں آرام سے سفر کر کے دوسرے دن اپنی منزلِ مقصود پر پہنچتے ہی اپنا کام شروع کر سکتا ہو تو وہ کیوں تھرڈ کلاس میں رات بھر کی بے آرامی مول لے، اور دوسرا دن کام میں صرف کرنے کے بجائے تکان دور کرنے میں صرف کرے؟ اگر وہ گرمی میں بجلی کا پنکھا استعمال کر کے زیادہ دماغی کام کر سکتا ہو تو وہ کیوں پسینوں میں شرابور ہو کر اپنی قوتِ کار کا بڑا حصہ ضائع کر دے؟ کیا ان سہولتوں کو وہ اس لیے چھوڑ دے کہ خدا کی یہ نعمتیں صرف شیطان کا کام کرنے والوں کے لیے ہیں، خدا کا کام کرنے والوں کے لیے نہیں ہیں؟ کیا انہیں جائز ذرائع سے فراہم کرنے کی قدرت رکھتے ہوئے بھی خواہ مخواہ چھوڑ دینا اور کام کے نقصان کو گوارا کر لینا حماقت نہیں ہے؟ کیا معترضین کا مطلب یہ ہے کہ شیطان کے سپاہی ہوائی جہاز پر چلیں اور خدا کے سپاہی ان کا مقابلہ چھکڑوں پر چل کر کریں؟ یا وہ یہ چاہتے ہیں کہ کام ہو یا نہ ہو، ہم صرف ان کا دل خوش کرنے کے لیے اپنے آپ کو فقیر بنا کر دکھاتے پھریں؟

---

## پوسٹ مارٹم، شقِ صدر اور دل و دماغ"

**سوالات :-**

۱۔ اسلامی حکومت میں نعشوں کی چیر پھاڑ ( Post-mortem ) کی کیا صورت اختیار کی جائے گی؟ اسلام تو لاشوں کی بے حرمتی کی اجازت نہیں دیتا۔ پوسٹ مارٹم دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک ( Medicco-legal ) زیادہ تر تفتیش کے

لیے، دوسرے علم الامراض کی (Pathological) ضروریات کے لیے، ممکن ہے کہ اوّل الذکر کی کچھ زیادہ اہمیت اسلامی حکومت میں نہ ہو، لیکن موخر الذکر کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اس طریقے سے امراض کی تشخیص اور طبی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

۲۔ سُنا گیا ہے کہ رسول اللہ صلعم کا سینۂ مبارک چاک کیا گیا تھا اور اس کو تمام آلائشوں سے پاک کیا گیا تھا، تاکہ نبوت کے تقاضے کو پورا کر سکیں اور معصومیت کی صفت پیدا ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں آپؐ کا دل زیادہ روشن ہو جائے۔ اچھے اور پاکیزہ خیالات دل میں آئیں اور گناہ کے خیالات نہ آنے پائیں۔ یہ کہاں تک صحیح ہے؟

۳۔ اسی کے ساتھ ساتھ ختم اللہ علیٰ قلوبھم سے معاً یہ خیال آتا ہے کہ گویا دل خیالات کی ایک جلوہ گاہ (Agency) ہے۔ شاید اس زمانے میں جالینوس کے نظریات کے تحت "دل" کو سرچشمۂ افکار (Originator of Thought) سمجھا جاتا تھا، لیکن آج کل میڈیکل تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ دل صرف دورانِ خون کو جاری رکھنے والا ایک عضو ہے۔ اور ہر قسم کے خیالات اور حسیات اور ارادوں اور جذبات کا مرکز دماغ ہے۔ اس تحقیق کی وجہ سے ہر اس موقع پر الجھن پیدا ہوتی ہے جہاں "دل" سے کوئی ایسی چیز منسوب کی جاتی ہے جس کا تعلق حقیقت میں دماغ سے ہوتا ہے۔

## جوابات:

۱۔ پوسٹ مارٹم کے مسئلے پر میں اب تک کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکا ہوں۔ یہ بھی مانتا ہوں کہ بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کے لیے یہ ناگزیر ہے، مگر اس کے باوجود طبیعت میں سخت کراہت پاتا ہوں، اور احکامِ شرعیہ میں بھی انتہائی ناگزیر صورت کے بغیر اس کے لیے کوئی گنجائش مجھے نظر نہیں آتی۔ بہرحال یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جسے ایک اسلامی حکومت میں اہلِ علم باہمی مشورے سے طے نہ کر سکتے ہوں۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ مبارک کے چاک کیے جانے کا معاملہ متشابہات کے قبیل سے ہے۔ اسے سمجھنا ہمارے بس میں نہیں، اس لیے اس پر کسی تحقیق کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔

۳۔ "دل" کا لفظ ادب کی زبان میں کبھی اس معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے جس میں یہ لفظ علم تشریح (Anatomy) اور علم وظائف الاعضا (Physiology) میں استعمال ہوتا ہے۔ ادب میں "دماغ" (Cold Reason) کی نمائندگی کرتا ہے اور اس کے برعکس "دل" جذبات و حسیات اور خواہش اور ارادے کا مرکز مانا جاتا ہے۔ ہم رات دن بولتے ہیں کہ میرا دل نہیں مانتا، میرے دل میں یہ خیال آیا، میرا دل یہ چاہتا ہے۔ انگریزی میں (Qualities of Head & Heart) کا فقرہ بکثرت استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ الفاظ بولتے وقت کوئی شخص بھی علم تشریح والا دل مراد نہیں لیتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا آغاز اسی نظریہ کے تحت ہوا ہو جو جالینوس کی طرف منسوب ہے۔ لیکن ادب میں جو الفاظ رائج ہو جاتے ہیں وہ بسا اوقات اپنے ابتدائی معنی کے تابع نہیں رہتے۔

---

# ہدایت و ضلالت کے درمیان

**سوال:۔**

بڑی شدید ذہنی کشمکش میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ دو سال پیشتر جماعت سے متاثر ہوا اور تحریک سے ہمدردی کا تعلق قائم ہے۔ چنانچہ جب سے اب تک دوسروں کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ لیکن ایک مدت تک میں خود اپنے آپ کو عملی لحاظ سے کچھ بھی نہ بدل سکا۔ فروری ۱۹۵۱ء میں احساس پیدا ہوا اور اپنا محاسبہ کرنے پر توجہ ہوئی تو اپنے آپ کو صبغۃ اللہ میں رنگنے کا فیصلہ کر لیا۔ سینما سے قطعی پرہیز شروع کیا، گندے لٹریچر کو بھی چھوڑا، کاروبار میں بھی ایماندارانہ طریقے اختیار کر لیے، لیکن مہینہ ڈیڑھ مہینہ اپنے فیصلے کی سختی سے پابندی کرنے کے بعد ایک ناقابل فتح ذہنی تحریک کے تحت پھر سینما دیکھ ڈالا، پھر احساس

ہوا مگر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد جب کبھی اندرونی خواہش پیدا ہوئی، تو ہزار کوشش کرنے باوجود اس سے کبھی نجات حاصل نہ ہو سکی۔ لین دین میں ایک مرتبہ دانستہ امانت داری کے خلاف ایک حرکت کا ارتکاب کیا۔ نماز بھی چھوٹ گئی، ایک رشتہ دار لڑکی سے "معصوم سی" پرانی دلچسپی تھی وہ بھی عود کر آئی ہے اور اس سے خواہ مخواہ باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے، گانا ترک کر دیا تھا لیکن یہ ذوق بھی اب پھر ابھر آیا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ چونکہ اسلام کی دعوت کا کام بدستور اپنے حلقۂ اثر میں کر رہا ہوں لہٰذا یہ سب کچھ دوسروں سے چھپا کر کرتا ہوں اور برابر یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہوں کہ میں ایک صالح مسلمان ہوں۔ نمازوں میں سے صرف ایک نماز (عصر) جو دفتر کے اوقات میں آتی ہے (واضح رہے کہ میں اب ملازم ہوں)، محض اس لیے ادا کرتا ہوں کہ کام کے ساتھیوں کو، جن میں دعوت کا کام کرتا ہوں مطمئن رکھ سکوں کہ میری زندگی دعوت کے عین مطابق ہے۔

اپنی اس حالت پر بار بار غور کیا، کبھی مایوسی ہوتی ہے، کبھی بے چینی، کبھی ندامت، کبھی روتا ہوں، کبھی دعائیں مانگتا ہوں، مگر عملی زندگی مطلوبہ نقشے پر استوار ہونے میں نہیں آتی۔ سوچتا ہوں کہ عمل کا دار و مدار تعلق باللہ پر ہے، لیکن تعلق باللہ کیسے پیدا ہو؟ جماعت کے لٹریچر کا مسلسل مطالعہ کرتا ہوں مگر پھر بھی کچھ نہیں بنتا۔ مجھے رہنمائی بہم پہنچائیے کہ میں کیا کروں؟

**جواب:۔**

آپ نے جو حالات لکھے ہیں ان کو دیکھ کر میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ اپنے مرض کو طویل مدت تک پال لینے کے بعد اب علاج کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ آپ کو اول ہی روز یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ آدمی کا اپنے عقیدہ و علم کے خلاف کام کرنا (یعنی جسے وہ ایمانداری کے ساتھ فرض سمجھتا ہو اسے ادا نہ کرنا، اور جن کاموں کو وہ ناجائز سمجھتا ہو انہیں کر گزرنا) ایک سخت کمزوری ہے جو نہ صرف آدمی کے کیریکٹر کو بودا بنا دیتی ہے، بلکہ بتدریج اسے منافق بنا کر چھوڑتی ہے۔ پھر ایسے شخص کا دوسروں کو تبلیغ کرنا، اور اس خیال سے چھپ چھپ کر گناہ

کرتے رہنا کہ اگر علانیہ ان افعال کا ارتکاب کروں گا تو جنہیں میں تبلیغ کر رہا ہوں وہ مجھ پر حرف زنی کریں گے، یہ تو اپنے اندر منافقت کو پرورش کرنے کا یقینی نسخہ ہے۔ اگر آپ ابتدا ہی میں جب کہ یہ کمزوریاں آپ سے رونما ہو رہی تھیں مجھے اس کی اطلاع دے دیتے تو میں آپ کو اس سے بچانے کی کوشش کرتا، اور اس وقت یہ زیادہ آسان ہوتا۔ مگر اب آپ یہ مرض اچھی طرح پرورش کرنے کے بعد مجھے اطلاع دے رہے ہیں۔

بہرحال اب مجھے آپ کے بچنے کی ایک ہی صورت نظر آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ:

(۱) آپ برابر تبلیغ کرتے رہیں۔

(۲) جن کمزوریوں میں آپ مبتلا ہیں ان کو چھپانے کی کوشش نہ کریں۔ اگر ترکِ نماز کی بیماری آپ کے اندر موجود ہے تو کبھی لوگوں کے سامنے اس خیال سے نماز نہ پڑھیں کہ وہ آپ کو پابندِ نماز سمجھتے رہیں۔ اور اسی طرح اگر آپ سینما دیکھتے ہیں تو پھر علانیہ اسی جگہ سینما دیکھنے جائیں جہاں آپ لوگوں کے سامنے اس کے خلاف اظہارِ رائے کیا کرتے ہیں۔ اور پھر جب وہ آپ کو ملامت کریں تو اپنے اس فعل کی تاویلیں کرنے کی کوشش نہ کیجیے بلکہ ان سے کہیے کہ میں ضعفِ سیرت کا بیمار ہوں، مجھے اتنی ملامت کرو کہ آخر کار میرا یہ مرض دور ہو جائے۔

اس نسخے کو کچھ مدت آزما کر دیکھیے۔ اگر اپنے اندر کچھ ترقی محسوس کریں تو اس کی اطلاع مجھے دیجیے تاکہ میں آگے کی بات آپ کو بتاؤں۔ اور اگر یہ محسوس کریں کہ اس طریق کار سے آپ کے اندر اُلٹی ڈھٹائی پیدا ہو رہی ہے تو اس کی بھی اطلاع دیں تاکہ میں دوسری تدبیر سوچوں۔

---

## نکاحِ شغار کی تین صورتیں

**سوال:** مسلمانوں میں عموماً رواج ہو گیا ہے کہ دو شخص باہم لڑکوں لڑکیوں کی شادی ادل بدل کے اصول پر کرتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی اشخاص مل کر اس طرح کا ادل بدل کرتے ہیں۔ مثلاً زید بکر کے لڑکے کے ساتھ، بکر عمر کے لڑکے کے ساتھ اور عمر زید کے لڑکے کے ساتھ اپنی لڑکیوں کا نکاح کر دیتے ہیں۔ ان صورتوں میں عموماً مہر کی ایک ہی مقدار ہوتی ہے

بعض علمائے دین اس طریقہ کو شغار کہتے ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ شغار کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے بلکہ حرام قرار دیا ہے۔

بحالاتِ موجودہ ایک غریب آدمی یہ طریقہ اختیار کرنے پر مجبور بھی ہوتا ہے، کیونکہ جس آسانی سے دوسرے لوگ اس کی لڑکی کو قبول کرنے پر تیار ہوتے ہیں اس آسانی سے اس کے لڑکے کو رشتہ دینے پر تیار نہیں ہوتے۔

براہِ کرم اس مسئلہ کی حقیقت واضح فرمادیں۔

**جواب:**۔ عام طور پر ادلے بدلے کے نکاح کا جو طریقہ ہمارے ملک میں رائج ہے وہ دراصل شغار کی تعریف میں آتا ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ شغار کی تین صورتیں ہیں اور وہ سب ناجائز ہیں۔

ایک یہ کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو اس شرط پر اپنی لڑکی دے کہ وہ اس کو بدلے میں اپنی لڑکی دیگا اور ان میں سے ہر ایک لڑکی دوسری لڑکی کا مہر قرار پائے۔

دوسرے یہ کہ شرط تو وہی ادلے بدلے کی ہو مگر دونوں کے برابر برابر مہر (مثلاً ۵۰۔ ۵۰ ہزار روپیہ) مقرر کئے جائیں اور محض فرضی طور پر فریقین میں ان مساوی رقموں کا تبادلہ کر لیا جائے۔ دونوں لڑکیوں کو عملاً ایک پیسہ بھی نہ ملے۔

تیسرے یہ کہ ادلے بدلے کا معاملہ فریقین میں صرف زبانی طور پر ہی طے نہ ہو بلکہ ایک لڑکی کے نکاح میں دوسری لڑکی کا نکاح شرط کے طور پر شامل ہو۔

ان تینوں صورتوں میں سے جو صورت بھی اختیار کی جائے گی، شریعت کے خلاف ہو گی۔ پہلی صورت کے ناجائز ہونے پر تو تمام فقہا کا اتفاق ہے البتہ باقی دو صورتوں کے معاملہ میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ لیکن مجھے دلائلِ شرعیہ کی بنا پر یہ اطمینان حاصل ہے کہ یہ تینوں صورتیں شغارِ ممنوع کی تعریف میں آتی ہیں اور تینوں صورتوں میں اُس معاشرتی فساد کے اسباب یکساں طور پر موجود ہیں جن کی وجہ سے شغار کو منع کیا گیا ہے۔

# اہون البلیتین

سوال :-

" اختیارِ اَهْوَنُ البَلِیَّتَین " ( دو بلاؤں میں سے کم درجے کی بلا کو اختیار کرنے کا مسئلہ ) ایک سلسلے میں مجھ کو عرصہ سے کھٹک رہا ہے ۔ آج کل اس مسئلہ کا استعمال کچھ اس طرح ہو رہا ہے کہ وضاحت ضروری ہو گئی ہے ۔

ہم مسلمانوں میں سے چوٹی کے حضرات ( جیسے علمائے دیوبند، مولینا حسین احمد مدنی اور مولینا ابوالکلام آزاد ) کا جماعت اسلامی کے پیش کردہ نصب العین سے دور ہو جانا ایک ایسا سوال ہے جس پر میں دل ہی دل میں برابر غور کرتا رہا ہوں ۔ میرا خیال یہ ہوا کہ ان حضرات کی نگاہ میں اس نصب العین کا ترک کرنا اہون ہو گا لہذا انہوں نے ترک کیا اور جماعتِ اسلامی کے نزدیک اس کا قبول کرنا اہون ہو گا لہذا اس نے اسے اختیار کر لیا ۔ میں اسی سوچ بچار میں تھا کہ ترجمان القرآن میں مولینا مدنی کی ایک تحریر پڑھی جس میں واقعی یہ اقرار موجود تھا کہ اہون البلیتین کو انہوں نے اختیار فرمایا ہے ۔ اس پر مجھ کو حیرت ہوئی ۔ پوری بات اور آگے چل کر کھلی جب " الانصاف " ( انڈیا ) میں جمعیت کی پالیسی کے متعلق مولینا کا یہ بیان نظر سے گذرا کہ کانگریس اور کمیونسٹ جو دو بلیتین تھیں ان میں سے ہم نے اہون یعنی کانگریس کو اختیار کیا ہے ۔

میں یہ سمجھتا تھا کہ قرآن نے حالتِ اضطرار میں سور کا گوشت کھا لینے کی اجازت جہاں دی ہے وہاں بلیتین سے مراد اس حرام کے ترک یا اختیار کی دو متبادل صورتیں ہیں ۔ یعنی یا تو آدمی سور کھا کر جان بچا لے یا نہ کھا کر مقامِ عزیمت پر فائز ہونے کی فضیلت حاصل کرے ۔ لیکن کیا اس سے یہ بھی مراد ہے کہ دو حرام چیزوں میں سے ایک کو اہون سمجھ کر منتخب کیا جائے، مثلاً ایک طرف سور کا گوشت ہو اور دوسری طرف گدھے کا گوشت تو کیا ایک فاقہ

سے مرنے والا یوں سوچے گا کہ سؤر کا گوشت زیادہ ثقیل ہے اور گدھے کا گوشت زود ہضم ہے لہٰذا اہون گدھے کا گوشت ہوا۔

## جواب:

اختیار اہون البلیتین سے مراد یہ ہے کہ جب دو ناجائز کاموں میں سے کسی ایک کا اختیار کرنا ناگزیر ہو جائے تو ان میں سے وہ اختیار کیا جائے جو کم تر درجے کا ناجائز کام ہو۔ اس میں شرطِ اول یہ ہے کہ خیر کی راہ بالکل بند ہو اور اسے اختیار کرنے کا قطعاً کوئی امکان نہ ہو۔ صرف اسی صورت میں آدمی کے لئے اہون البلیتین کو اختیار کرنا جائز ہو سکتا ہے، ورنہ خیر کی راہ کا کچھ بھی امکان ہو تو وہ شخص گنہ گار ہو گا جو محض اپنی کم ہمتی کی بنا پر اپنے آپ کو دو ناجائز کاموں میں سے کسی ایک میں مبتلا کر دے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ دو ناجائز کاموں میں سے ایک کو اہون بس یونہی نہ ٹھیرا لیا جائے بلکہ اصول شریعت کے لحاظ سے دیکھا جائے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے کسی بلا کو اہون اور کس کو اشد قرار دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً میں آپ ہی کی دی ہوئی مثال کو لیتا ہوں۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص سخت بھوک میں مبتلا ہے اور موت سے بچنے کے لئے اس کے سامنے صرف دو ہی غذائیں موجود ہیں، ایک سؤر کا گوشت، دوسرے گدھے کا گوشت۔ اب اگر وہ اسلامی نقطۂ نظر سے فیصلہ کرے تو لامحالہ گدھے کا گوشت اہون ہو گا؛ کیوں کہ اس کے حرام ہونے کی صراحت قرآن میں نہیں کی گئی ہے، بلکہ حدیث میں ایک اصول بیان کیا گیا ہے جس کا اطلاق گدھے پر بھی ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے سؤر کا گوشت اشد ہو گا، کیوں کہ قرآن میں اس کے حرام ہونے کی تصریح ہے۔ یا مثلاً کوئی طاقت ور ظالم کسی بے گناہ کی جان کے درپے ہو اور وہ بے گناہ آپ کے پاس پناہ لے اور آپ کسی طرح لڑ کر اس بے گناہ کو نہ بچا سکتے ہوں۔ ایسی صورت میں اگر وہ ظالم آ کر آپ سے اس کا پتہ پوچھے تو آپ کے لئے دو صورتیں ممکن ہوں گی۔ یا تو جھوٹ بول کر اس کی جان بچا لیں۔ یا اس کا پتہ بتا کر اسے قتل کے لئے پیش کر دیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں جھوٹ بولنا اہون ہے۔ کیوں کہ سچ بولنے سے ایک شدید تر برائی "یعنی قتلِ مظلوم" لازم آتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس جواب سے آپ کی تشفی ہو جائے گی۔

# تبلیغی جماعت سے ایک دوستانہ شکایت

سوال: پچھلے دنوں سکھر میں تبلیغی جماعت کا ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا تھا جس میں ہندوستان و پاکستان کی تبلیغی جماعت کے امیر جناب مولانا محمد یوسف صاحب (صاحبزادہ و جانشین مولانا محمد الیاس صاحب مرحوم) خود تشریف لاتے تھے۔ جماعت اسلامی سکھر نے فیصلہ کیا کہ اس موقع پر جلسہ گاہ کے حدود میں اپنا ایک بک اسٹال لگائے۔ چنانچہ منتظمین سے مل کر انہوں نے دریافت کیا کہ آپ کو اس پر کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔ ان کے ایک ذمہ دار بزرگ نے جواب دیا کہ اس میں اعتراض کی کونسی وجہ ہو سکتی ہے۔ آپ شوق سے اپنا مکتبہ لگائیں۔ اس کے بعد ان سے اسٹال کے لیے جگہ بھی طے ہو گئی۔ مگر دوسرے روز شام کو جب فضل مبین صاحب امیر جماعت اسلامی سکھر نے وہاں جا کر اسٹال لگوانے کا انتظام شروع کیا تو انہیں یکایک اس سے منع کر دیا گیا۔ وجہ پوچھی گئی تو ایک ذمہ دار بزرگ نے جواب دیا کہ "ہماری مجلس شوریٰ نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم نہ آپ کو مکتبہ لگانے کی اجازت دیں گے اور نہ آپ سے کسی قسم کا دوسرا تعاون لیں گے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ ایک سیاسی جماعت ہیں"۔ اس جواب اور اس طرزِ عمل پر جو تعجب ہوا، اس پر مزید تعجب اس بات پر ہوا کہ وہاں دوسرے متعدد بک اسٹال موجود تھے اور اس پر ان حضرات کو کوئی اعتراض نہ تھا، مگر جماعت اسلامی کے متعلق ان کی خواہش یہ تھی کہ ان کی جلسہ گاہ سے ایک میل تک بھی اس کا مکتبہ نظر نہ آئے۔

اس پر ۱۱ اپریل کو ڈاکٹر سلیم الدین صاحب امیر جماعت اسلامی حلقۂ بالائی سندھ، فضل مبین احمد صاحب امیر جماعت شہر سکھر، اور مولوی قربان علی صاحب رکن جماعت، مولانا محمد یوسف صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے عرض کیا کہ "اب تک تو ہم یہی سمجھتے تھے کہ جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت مقصد میں متحد ہیں اور صرف طریقِ کار میں فرق ہے لیکن یہ سلوک جو ہمارے ساتھ کیا گیا ہے، یہ اس باہمی اخلاص اور تعاون کو نقصان

پہنچانے والا ہے جو دین کی خدمت کرنے والی ان دو جماعتوں کے درمیان اب تک رہا ہے اور ہمیشہ رہنا چاہیے۔ کیا آپ واقعی ہمیں محض ایک سیاسی جماعت سمجھتے ہیں؟ اس پر حضرت جی (مولانا محمد یوسف صاحب اسی نام سے یاد کیے جاتے ہیں) نے فرمایا:۔

"میں اس مکتبے وغیرہ کے سخت خلاف ہوں۔ اور یہ لوگوں نے طریقہ بنا لیا ہے کہ وہ لوگوں کی جیبوں سے پیسے حاصل کرنے کے لیے کتابیں لکھتے ہیں۔ اسی علم نے یہ خرابیاں پیدا کی ہیں۔ فساد کی جڑ یہی ہے۔ میں کتابیں لکھنے، اخبار چھاپنے اور اسی قسم کی چیزیں کرنے کا سخت مخالف ہوں۔ اصل میں انہی چیزوں نے مسلمانوں کو بے عمل کر دیا ہے اور یہ چیزیں مجاہدے کا بدل نہیں ہو سکتیں"۔

یہ ارشاد سن کر ہمیں دوگونہ حیرت ہوئی۔ ایک اس بنا پر کہ حضرت جی اگر مکتبے وغیرہ کے ایسے ہی سخت خلاف تھے تو جماعت اسلامی کے سوا دوسرے مکتبے جلسہ گاہ میں کیسے برداشت کیے گئے؟ دوسرے اس بنا پر کہ کتابوں اور رسائل کی اشاعت اور قیمتاً ان کو فروخت کرنے کا گناہ تو دیوبند اور سہارنپور اور تھانہ بھون کے بزرگ بھی کرتے رہے ہیں، بلکہ خود تبلیغی جماعت کے بھی متعدد نامور بزرگوں سے اس کا صدور ہوا ہے۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ وہ یہی کام کریں تو خدمت دین، اور دوسرے کریں تو صرف پیسے بٹورتے ہیں؟ پھر "اکرام مسلم" کا بھی یہ عجیب تصور ہمارے لیے باعث حیرت تھا کہ فسق کے علمبرداروں کے خلاف زبان کھولنا تو اکرام مسلم کے خلاف ہو، مگر ایک دینی خدمت کرنے والی جماعت کے کام اور مقصد کا کھلم کھلا استخفاف کرنا اور اس کی نیت تک پر حملہ کرنا عین اکرام مسلم ہو۔

اس کے بعد حضرت جی نے فرمایا: "آپ تو حکومت کے طالب ہیں۔ آپ اس چیز کے طالب ہیں جو مردود ہے۔ حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت حکومت پیش کی گئی مگر آپ نے اس کو رد کر دیا، ٹھکرا دیا، اور نبوت عبدیت قبول کی۔ آپ کا یہ خیال کہ حکومت و بادشاہت میں تبدیلی ہو جاتے تو اسلام زندہ ہو جائے گا بالکل غلط ہے"۔

حاضرین میں سے ایک صاحب کے اس سوال پر کہ کلمۃ الحق عند سلطان جائر کے کیا معنی ہیں، حضرت نے فرمایا یہ اس وقت کے لیے ہے جب پورا معاشرہ درست ہو اور صرف حکومت میں خرابی نظر آتی ہو۔ اس وقت کلمۂ حق کہنا درست ہے تاکہ جو خرابی ابھی صرف حکومت تک محدود ہے وہ آگے نہ بڑھنے پائے۔ اس وقت یہ موقع نہیں ہے۔

دوران گفتگو میں حضرت جی نے یہ بھی فرمایا کہ اس وقت جو لوگ برسراقتدار ہیں وہ تم سے بہتر ہیں۔ ایمان میں، اعمال میں، تدبیر میں اور قابلیت میں وہ آپ سے بہتر ہیں۔ آپ ان کے بجائے کون سے لوگ لائیں گے؟

اب سوال یہ ہے کہ اس جماعت کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے؟ یہ سوال اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اگر وہ چاہیگا اور اسی طرح کے تلخ تجربات ہوتے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ان دونوں دینی جماعتوں کے درمیان باہمی اکرام و اخلاص اور ہمدردی کا جو تعلق اب تک رہا ہے اس میں فرق واقع ہو جائے۔ لہٰذا اس باب میں جماعت کے کارکنوں کو واضح ہدایات مل جانی چاہئیں۔

**جواب**: یہ روداد، جو جماعت اسلامی کے ذمہ دار کارکنوں نے ہمارے پاس بھیجی ہے، اسے پڑھ کر فی الواقع ہمیں دلی صدمہ ہوا۔ اس سے پہلے مشرقی پاکستان سے ہمارے پاس یہ شکایت آئی تھی کہ وہاں کے ایک بڑے سرکاری عہدہ دار، جو تبلیغی جماعت میں بھی نمایاں مقام رکھتے ہیں، مختلف مقامات پر دارالمطالعے قائم فرما رہے ہیں اور ان میں یہ شرط لگا دیتے ہیں کہ جماعت اسلامی کا لٹریچر ہرگز نہ آنے پائے۔ ہم نے اسے ان کا ایک ذاتی فعل سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ مگر اب خود مولانا محمد یوسف صاحب کی موجودگی میں تبلیغی جماعت کی مجلس شوریٰ کا فیصلہ اور پھر مولانا موصوف کا اس کی توثیق فرمانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ کسی فرد خاص کا انفرادی رجحان نہیں ہے بلکہ یہ ایک اجتماعی روش ہے۔ اس پر سوائے اس کے کہ افسوس کیا جائے، اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال، جماعت اسلامی کے کارکنوں کو اس پر برا نہ ماننا چاہیے۔ اب نہ سہی کسی نہ کسی وقت انشاءاللہ ان حضرات کو اس طرز عمل کی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔ خدمت دین کے لیے دو یا دو سے زیادہ گروہ اپنے اپنے طریقے کے مطابق کام کر سکتے ہیں، اور ایک دوسرے کے طریقے سے اختلاف بھی رکھ سکتے ہیں، مگر یہ بات

ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ ان میں سے کوئی گروہ بھی آخر کیوں اس میدان میں صرف اپنے آپ ہی کو دیکھنا چاہتا ہے اور دوسرے کے وجود کو برداشت نہ کرے؟ دین کی خدمت کوئی کاروبار تو نہیں ہے کہ یہاں ایک خادم دوسرے کو اپنا رقیب سمجھے! رقابت تو دوکانداروں میں ہوتی ہے۔ یہ کام اگر ہم دوکانداری کے طور پر کر رہے ہیں تو ہم پر اور ہمارے اس کاروبار پر ہزار لعنت۔ اور اگر یہ اخلاص کی بنا پر خدا کے دین کی خدمت ہے، تو ہم میں سے ہر ایک کو خوش ہونا چاہیے کہ یہ کام تنہا وہی نہیں کر رہا ہے، دوسرے بھی اس میں سرگرم کار ہیں۔ اس لیے خواہ کوئی ہمیں رقیب ہی سمجھ کر دور پھینکنے کی کوشش کرے، ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اسے رقیب نہ سمجھیں اور بار بار اس کے قریب جائیں، یہاں تک کہ اللہ اس کا دل بھی بدل دے۔

ہماری سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آتی کہ بعض علماء، اور ارباب حکومت اور بعض دوسرے گروہ کچھ مدت سے یہ کوشش کیوں کر رہے ہیں کہ جماعت اسلامی کا لٹریچر کسی طرح ان کے حلقۂ اثر میں نہ پہنچنے پائے۔ کہیں اس کے پڑھنے پڑھانے سے منع کیا جا رہا ہے۔ کہیں دار المطالعوں اور کتب خانوں میں اس کی آمد کو روکا جا رہا ہے۔ کہیں ان لوگوں کو مدرسوں اور ملازمتوں سے نکالا جا رہا ہے جن کے پاس یہ لٹریچر دیکھا گیا۔ کہیں دوسرے طریقوں سے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ لوگ اس لٹریچر سے آشنا ہی نہ ہونے پائیں۔ بلکہ کہیں تو یہاں تک کہا جا رہا ہے کہ جماعت اسلامی کی کوئی چیز سنو بھی نہیں۔ ہم حیران ہیں کہ یہ کان اور آنکھیں بند کرنے کی تدبیریں آخر کس وجہ سے کی جا رہی ہیں؟ ہمارے دلوں میں تو کبھی اس کا خیال تک بھی نہیں آیا کہ ہم سے تعلق رکھنے والے لوگ کسی کی چیز پڑھنے اور کسی کی بات سننے سے احتراز کریں۔ جماعت کے ارکان اور متفقین ہر قسم کی چیزیں پڑھتے ہیں۔ ہر ایک کی بات کھلے دل اور کھلے کانوں سے سنتے ہیں۔ جماعت خود یہ کوشش کرتی ہے کہ اس کے حلقے کے لوگ دنیا بھر کی چیزیں پڑھیں اور سنیں تاکہ ان کی نظر وسیع ہو اور وہ زیادہ اچھی طرح رائے قائم کرنے کے قابل ہوں۔ حد یہ ہے کہ جماعت کے خلاف جس جس گروہ کی طرف سے جتنا کچھ بھی لکھا جاتا ہے وہ سب جماعت کے حلقوں میں آزادی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ پھر یہ ہمارے دوسرے بھائیوں کو آخر کیا ہوا ہے کہ وہ ہمارے معاملے میں چشم بندی و گوش بندی کی پالیسی کو ترجیح دیتے ہیں؟ کیا یہ اس بات کا کھلا اعتراف نہیں ہے کہ وہ اپنے موقف کی کمزوری اور ہمارے موقف کی مضبوطی کا خود احساس رکھتے

ہیں؟ کیا اس کا صاف مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے دائرۂ اثر کے لوگوں کو تاریکی میں رکھنا چاہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ بس اسی وقت تک ان کے اثر میں ہیں جب تک یہ ان کی بنائی ہوئی محفوظ پناہ گاہ میں محصور ہیں؟ اور کیا خود وہ لوگ جو اپنے اُستادوں اور پیروں اور سرداروں کے باندھے ہوئے اس حصار میں رہنے پر راضی ہو جاتے ہیں اپنی جگہ یہ نہیں سوچتے کہ ایک بہتر اور مضبوط موقف رکھنے والا کب اس بات سے ڈرا کرتا ہے کہ دوسرے کسی شخص کے دلائل سن کر اس کے حلقۂ اثر کے لوگ متنزلزل ہو جائیں گے۔

مولانا محمد یوسف صاحب کے متعلق ہمیں یہ بدگمانی نہیں ہے کہ انہوں نے ہماری دعوت کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد اس کا یہ خلاصہ نکالا ہوگا کہ "ہم بس حکومت چاہتے ہیں"۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ بے چارے خود اُس حصار کے شکار ہوئے ہیں جو مذہبی گھرانوں میں پرورش پانے والوں کے گرد عموماً کھینچ دیا جاتا ہے۔ اس حصار میں محصور ہونے کی وجہ سے انہوں نے ہماری کوئی چیز نہ پڑھی، نہ پڑھنے کی ضرورت محسوس کی۔ محض سنی سنائی باتوں سے ہماری دعوت کا یہ عجیب سا خلاصہ نکال لیا۔ اگر وہ ایک مخلص خیر خواہ کی گذارش کو قابل توجہ سمجھیں تو ان سے عرض کیا جائے کہ اگر رائے زنی کرنی ضروری ہی ہو تو اظہار رائے سے پہلے اس چیز سے واقفیت بہم پہنچانی چاہیے جس پر آپ رائے ظاہر کر رہے ہوں۔ اور اگر آپ کو اس کی فرصت نہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ ناکافی معلومات کی بنا پر آپ کوئی رائے ظاہر نہ فرمائیں۔

---

# ایک اور فتوے

**سوال:**

یہاں سے فتوے دریافت کرنے کے لئے مولانا مولوی کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم دہلی کے پاس روانہ کیا گیا تھا کہ مولانا مولوی سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کی اتباع جائز

ہے یا ناجائز ہے۔

جواب وہاں سے یہ آیا کہ مولانا مولوی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کسی بھی امام کے قائل نہیں ہیں۔ آزاد خیال آدمی ہیں۔ اس لئے ان کا اتباع شرعاً ناجائز ہے۔

اس لئے آپ سے استدعا ہے کہ آپ اپنے خیال کا اظہار فرمائیں۔

## جواب:

میں حیران ہوں کہ جن لوگوں نے مولانا کفایت اللہ صاحب سے یہ سوال کیا تھا انہوں نے یہ کیوں نہ سوچا کہ یہی مولانا کفایت اللہ صاحب تیس سال سے گاندھی اور نہرو کا اتباع فرما رہے ہیں اور آج بھی انہوں نے یہ فتوے دیا ہے کہ مسلمانوں کو کانگریس کے حق میں ووٹ دینا چاہیے۔ کیا کانگریس کسی امام کی قائل ہے؟ بلکہ کیا کانگریس خدا اور رسول کو بھی مانتی ہے؟ پھر جو عالمِ دین کانگریس کے معاملہ میں تو اماموں کو ماننے یا نہ ماننے کا لحاظ نہ کرے، مگر جماعت اسلامی کے معاملہ میں اسے امام یاد آنے لگیں کیا وہ اس قابل بھی ہے کہ اس کے فتوے کا لحاظ کیا جائے؟

---

## سوال:

آپ کس امام کے پیرو ہیں؟

## جواب:

میں اصل میں تو صرف ایک امام کا پیرو ہوں جس کا نام نامی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ البتہ فقہی مسائل میں میرا طریقہ یہ ہے کہ جس مسئلے کی تحقیق کا مجھے موقع نہیں ملتا اس میں امام ابوحنیفہؒ کی پیروی کرتا ہوں، کیوں کہ ان کے مذہب کے اکثر مسائل کو میں نے اپنے اصلی امام کی تعلیم کے زیادہ موافق پایا ہے۔ مگر جس مسئلے میں مجھے تحقیق کا موقع مل جاتا ہے اس میں چاروں اماموں کے مذہب پر نظر ڈالتا ہوں اور جس کی تحقیق کو قرآن و حدیث کے منشا سے زیادہ قریب پاتا ہوں اس کی پیروی کرتا ہوں۔

---

# شکاری کُتّے، بندوق اور تیر کے ذریعے شکار

مندرجہ ذیل سوالات کا جواب مطلوب ہے:

سوال:

(۱) تکبیر پڑھ کر بندوق چلانے سے شکار اگر بغیر حلال کئے مر جائے تو وہ حلال ہے یا حرام؟

(۲) اسی طرح تکبیر پڑھ کر تیر چلانے سے اور شکاری کُتّا چھوڑنے سے جو شکار بغیر ذبح کئے مر جائے اُس کا حکم کیا ہے؟

(۳) اسلامی تاریخ یا کسی اور کتاب کے مطابق بندوق کی ایجاد کس سنہ ہجری میں ہوئی ہے؟

جواب:

تکبیر پڑھ کر بندوق چلانے سے شکار اگر ذبح کئے بغیر مر جائے تو میرے نزدیک حلال ہے۔ میں اسے تیر پہ قیاس کرتا ہوں لیکن علماء کو اس سے اختلاف ہے کیونکہ وہ بندوق کی گولی کو غلیل کے غلّے پہ قیاس کرتے ہیں۔ عملاً میں خود بھی ایسے جانور کو کھانے سے پرہیز کرتا ہوں۔

تکبیر پڑھ کر تیر چلانے سے جو شکار مر جائے وہ بالاتفاق حلال ہے۔ اس کی تصریح حدیث میں آچکی ہے۔ اسی طرح جس کتے کو خدا کا نام لے کر شکار پر چھوڑا گیا ہو ــــ بشرطیکہ وہ سدھا ہوا کتا ہو ــــ اس کا مارا ہوا شکار بھی بالاتفاق حلال ہے۔ خود قرآن میں اس کی تصریح ہے۔

بندوق کی ایجاد کے متعلق مجھے اس وقت یاد نہیں کہ کس سنہ ہجری کی ایجاد ہے۔ غالباً پندرھویں صدی عیسوی سے پہلے یہ چیز دنیا میں موجود نہ تھی۔

**اعتذار:** چند در چند وجوہ سے ترجمان کا یہ شمارہ دیر سے شائع ہو رہا ہے اور صفحات میں بھی ۱۶ کی کمی ہے۔ انشاء اللہ آئندہ دو ماہ میں اسکی تلافی کر دی جائے گی۔ ــــ مینجر

# مطبُوعات

**اسلام میں حریت، مساوات، اخوت** تالیف جناب خواجہ عباد اللہ صاحب اختر۔ شائع کردہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور۔ قیمت ؏ روپیہ۔

یہ ایک مختصر کتاب بڑے اچھے کاغذ پر خوبصورت ٹائپ سے چھاپی گئی ہے۔ ہم پوری طرح یہ نہیں سمجھ سکے کہ کتاب کا مرکزی مقصود کیا ہے؟ مؤلف کی فکر صاف اور سلجھی ہوئی نہیں ہے۔ مثلاً مؤلف کا نظریۂ قانون یہ ہے کہ رسم و رواج میں آہستہ آہستہ تقدیس کا رنگ نمایاں ہوجاتا ہے اور ان کی معقولیت اور نامعقولیت کا خیال تک نہیں ہوتا بس انہی کو بعد میں "مذہبی فرائض" سے تعبیر کر دیا جاتا ہے"۔ یہ نظریۂ قانون ان لوگوں کا ایجاد کردہ ہے جنہوں نے تاریخ کو الحاد کی مادی عینک لگا کر پڑھا ہے۔ اس نظریہ کی تعلیم دینے کے لئے ہمارے لئے مغربی علمار کافی بھی تھے اور ماہر تر بھی۔ آخر ایک "ادارۂ ثقافت اسلامیہ" اس مقصد کے لئے وجود میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟ "مذہبی حس" کے متعلق بھی مؤلف کا نظریہ یہ ہے۔ کہ رسم و رواج کے خلاف عمل کرنے سے آدمی ہم حیثیتوں کی نظر میں بھی گر جاتا ہے، اور ان رسوم میں مذہبی تقدس محسوس ہونے کی وجہ سے ضمیر بھی اسے ملامت کرتا ہے۔ پس وہ یقین کرتا ہے کہ دنیا و آخرت میں وہ عذاب میں مبتلا ہوجائے گا۔ اور اس عذاب سے بچنے کے لئے وہ خیرات و صدقات کرتا ہے۔ پھر اسی مذکورہ بالا نظریۂ قانون کی حقیقت سمجھانے کے لئے اختر صاحب فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص تمدن سے کنارہ کش ہوکر جنگلوں، پہاڑوں میں جا بسے، تو وہ حکومتی اور مذہبی قانون کی پابندی کا مکلف نہیں رہتا اور نہ اس پر کسی کا کوئی حق ہوتا ہے اور نہ کسی دوسرے پر اس کا۔ یہ باتیں اگر اسلام کو درکنار رکھ کر کی جائیں تو ہمیں ان سے کوئی بحث نہیں، لیکن اگر اسلام کو مداخلت کی اجازت ہو تو پھر ہم عرض کریں گے یہ نقطۂ نظر سخت گمراہ کن ہے۔ انسان موجودہ دور میں تو ریاست کے تسلط اور مطالبات سے بھی کسی جنگل اور پہاڑ میں آزاد نہیں ہوسکتا، لیکن خیر اگر آپ اسے قوانینِ حکومت سے بالاتر بھی قرار دے رہے ہوں، تو کم سے کم اسلامی نظامِ حقوق سے وہ مستثنیٰ نہیں ہے۔ سب سے پہلے تو اس کے خدا کے حقوق ہیں جو مجرد وجود پانے ہی سے اس پر

عائد ہوجاتے ہیں اور اس کے لئے لازم ہوجاتا ہے کہ وہ ان کو جانے، ان کو سمجھے اور ان کو ادا کرے۔ پھر بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی کہ وہ خدا کے حضور خراجِ عبادات ادا کرتے۔ بلکہ اُس نے جو قوتیں اپنے رب کی طرف سے امانتہً پائی ہیں اُن قوتوں کا شکر ادا کرنے کے لئے انہیں نوعِ انسان کی فلاح کے لئے ایسی تمام صورتوں میں استعمال کرنا واجب ہے جو اللہ کے دین نے بتائی ہیں۔ دماغ ہے، زبان ہے۔ ہاتھ پاؤں ہیں، سرمندی ہے ——— ان سب قویٰ اور اعضا اور صلاحیتوں کے بارے میں خدا کے دین کے کچھ مطالبات ہیں۔ اور جب تک خدا ہی کے قانون کی رُو سے جائز وجہِ عذر موجود نہ ہو ان مطالبات سے سرتابی کرنا روا نہیں۔ آخر خلافت کا بارِ امانت اٹھائے ہوئے اسے اتار کر جنگل پہاڑ میں جا چھپنے کے لئے کوئی مضبوط اعتذار ہونا چاہیئے۔ پھر بات خدا ہی کے حقوق تک محدود نہیں اسلامی زاویۂ نگاہ سے انسان کا ایک ماں کے پیٹ میں پرورش پانا اور ایک خاندان میں پلنا سوسائٹی کے اتنے اداروں اور معاشرے کی اتنی خدمات کا شرمندۂ احسان ہوتا ہے کہ اس کے بعد وہ اگر تمدن کی زنجیریں تڑا کر جنگلوں، پہاڑوں کی طرف بھاگ نکلتا ہے تو وہ اپنے اسی اقدام سے بے شمار حق ماریاں کرچکتا ہے۔ وہ اگر قلۂ کوہ پر جا کر دھونی رماتا ہے تو اس کی حیثیت خدا ہی کے نہیں بلکہ بندوں کے بھی چور اور حق مار کی سی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلعم نے متاہل زندگی کو "سنتی" فرمایا اور اسے ترک کرنے والوں کو "لیس منی" جیسے سخت الفاظ کی وعید سنائی پھر لوگوں سے اختلاط کرنے والوں کو آپ نے خلوت پسندوں کے مقابلے میں زیادہ قابلِ قدر قرار دیا۔ اسلام نے استثنیٰ اگر دیا تو صرف ایسے لوگوں کو جو ستم میں رہنے کے لئے ایک ایسا ناسازگار ماحول اپنے گرد پائیں جسے وہ بدلنے کے لئے کچھ بھی نہ کر سکتے ہوں نیز جس سے نکلنے کے لئے ہجرت کا دروازہ بھی کھلا نہ پائیں، اور "اصحابِ کہف" جیسی مقدس ہستیوں کی طرح نظامِ تمدن کے باہر کسی گوشے میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں۔ مگر ایسے اصحاب بھی شریعت سے بالکل بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ اُن کے دماغ بہرحال کام کریں گے اور دماغی تحریکات کے لئے بھی شریعت کے کچھ قوانین ہیں۔ ان کو اپنے جسموں سمیت جینا ہوگا اور جسموں کے بھی کچھ واجبات ہیں۔ ان کو جانوروں، پرندوں اور نباتات سے واسطہ ہوگا۔ اور ان پر تصرف کرنے کے لئے بھی کچھ حدود ہیں۔ ان کو کسی خاص جگہ رہائش رکھنی ہوگی اور قیامگاہ کے لئے بھی کچھ طور طریقے ہیں۔ ان کو ستر پوشی بھی کرنی ہوگی اور ستر پوشی کے لئے بھی کوئی آئین ہے۔ ان پر کبھی نہ کبھی متمدن انسانوں کا گزر ہو سکتا ہے اور بھولے بھٹکے مسافروں کو ان سے

سابقہ پیش آسکتا ہے۔ ان کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ وہ اگر اپنی ضروریات کے لئے بکریاں پالیں تو ان بکریوں کے بھی حقوق عائد ہوں گے۔ اور اگر وہ قصاب کو بیچ جائیں تو اسلامی حکومت ان سے زکوٰۃ وصول کئے بغیر نہ رہیگی نجانے کس طرح یہ نظریہ بیان فرمادیا! کہ جونہی جنگل میں چلا جاتا ہے وہ قانونِ حکومت کے ساتھ ساتھ قانونِ اسلامی سے بھی کلیتہً بری الذمہ ہوجاتا ہے۔ اور کسی کا کوئی حق اس پر نہیں رہتا۔

پھر مؤلف فرماتے ہیں کہ اگر ایک معاشرے میں تمام کے تمام افراد بہ رضا و رغبت باہمی حقوق کا احترام کرنے لگیں تو ادارہ حکومت کی بہ نوعیت کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اسلام کی روسے یہ بھی غلط تصور ہے۔ حکومت جس تنظیم معاشرہ کا نام ہے بلاشبہ اس کا ایک بہت ہی بڑا مقصود توازنِ حقوق قائم کرنا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ بعض امور جو اجتماعی نظم کے ذریعے سرانجام پا سکتے ہیں، اُن کی ضرورت بھی اس کے وجود کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً رفاہِ عامہ کے اجتماعی کام، منافع کا اہتمام اور سب سے بڑھ کر ساری دنیا میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی مہم برپا کرنے کی ذمہ داری[1]

مؤلف نے "سبعاً من المثانی" کی بڑی "ترقی پسندانہ" تعبیر فرمائی ہے۔ یعنی آپ کے نزدیک توحید کو ماننا شرک سے بیزاری۔ قتل سے اجتناب۔ جھوٹ سے پرہیز۔ چوری سے اتقاء۔ بے حیائی سے دوری۔ وہ شرعی تلقینوں سے پاکدامنی۔ وہ سات احکام شرعی ہیں جن کو "سبعاً من المثانی" کہا گیا ہے لیکن "ترقی پسندی" اور "اجتہاد" کی تکمیل تو اس ارشاد سے ہوتی ہے کہ:-

"یہ احکام شریعت جنہیں لسانِ قرآن میں "صلوٰۃ" اور "زکوٰۃ" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو تمام دنیوی قوموں کے آئین و قوانین کی بنیاد ہیں . . . . ."

معلوم نہیں جدید [illegible] کی تحقیق کی داد دی جائے۔

جناب مؤلف نے "ان یشاء یذھبکم ویات بخلق جدید" الخ۔ کا ترجمہ یوں فرمایا ہے کہ جب بھی اللہ چاہے تمہیں لے جائے اور نئی پیدائش میں لائے جس کی نسبت تمہیں مایوس نہ ہونا چاہئے اور یہ امر اللہ پر کچھ مشکل نہیں اس خلق جدید میں، اگر کوئی کسی کو خواہ وہ اس کا قریبی ہی کیوں نہ ہو، اپنا بوجھ اٹھانے کے لئے

---

[1] اس حساب سے تو دنیا میں احکام معروف تھے اب یہ سات رہ گئے۔

کہے تو وہ بالکل نہیں اُٹھائے گا۔

سبحان اللہ! جزاکم اللہ! ——— مؤلف کے نزدیک آیت کا موضوع ارتقاء ہے یعنی اب تم جس حالت میں ہو اس سے نکال کر اللہ تم کو ایک ایسی ترقی یافتہ حالت میں لانے والا ہے جس میں ہر ایک کو اپنی ضروریات کے لیئے خود محنت کرنی ہوگی۔ اور کوئی کسی کا ملازم، مزدور اور قلی نہ رہے گا! مگر مؤلف فرماتے ہیں کہ سردست اس موضوع پر بحث کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ منزل ابھی بہت دور ہے۔

مؤلف نے "کان الناس امۃً واحدۃً فاختلفوا" اور اسی مضمون کی دوسری آیات میں لفظِ اختلاف سے مرادِ نظامِ زندگی کا نبوت (church) اور ملوکیت "(State)" میں تقسیم ہونا لیا ہے نیز "کان الناس امۃ واحدۃ" کی روشنی میں آپ فرماتے ہیں کہ ابتدائی دورِ انسانی وحدت و امن کا مظہر تھا۔ اور حکومت اور حکومت کے وضع کردہ آئین و قوانین محض انسانی صنعت ہیں"۔

آگے چل کر قرآن کی حقیقت کی نقاب کشائی یوں فرمائی ہے کہ:-

"قرآن توراۃ یا کسی اور دھرم شاستر یا ضابطۂ آئین و قوانین کی طرح کتابِ احکام نہیں لیکن جامع و مانع کتاب اصولِ احکام ہے۔ اور ان اصولوں کی تشریح کے لئے سات اصولی احکام (سبعاً من المثانی) بیان فرماتا ہے جو خود غیر متبدل ہیں قرآن میں اصولِ ہدایات ہیں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جو ایامِ جاہلیت میں انبیاء کا کام تھا اب جمہور کی نمائندہ جماعت شوریٰ میں منتقل ہوگیا، اور یہ امر و نہی یعنی احکام سب وقتی اجتہادات ہیں۔ اور خارجی حالات کے مناسب بدلنے چاہئیں۔ ان کا مذکور خواہ احادیث میں ہے یا احکامِ خلفاء ہیں۔ یا اجتہادات فقہاء ہیں، کوئی مستقل شریعت اسلامی نہیں ہے۔

کتاب میں اگرچہ بعض جگہ اچھی اچھی باتیں ہیں۔ لیکن اس کا مرکزی مزاج مذکورہ بالا اقتباسات سے نمایاں ہو جاتا ہے۔ مؤلف سائنٹیفک طریق پر خیالات کو مرتب نہیں کر پاتے بلکہ ادھوری ادھوری متفرق باتیں ایک خاص اسلوب سے لکھتے جاتے ہیں۔ اور لکھنے کا انداز بھی کمزور ہے کیونکہ صلہ موصول اور شرط و جزا کا ربط جا بجا گنجلک ہو جاتا ہے۔

**سبیل الرشاد** مؤلفہ: جناب ابوالحسن صاحب کلامی قیمت نامعلوم پبلشر نامعلوم۔

یہ رسالہ دستور ساز اسمبلی (پاکستان) کے لئے ایک میمورینڈم کے طور پر لکھا گیا ہے اور اس میں اسلامی دستوریات کو اصولی حد تک پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مرکزی فکر اسلامی ہے، خاکہ کے بیشتر اجزا اسلام کے خلاف نہیں ہیں، لیکن مؤلف دستوریات کا مطالعہ نہیں رکھتے چنانچہ تحریر کا مزاج دستوری نہیں ہے۔

مؤلف کی تجویز کی رُو سے پاکستان کے اسلامی دستور میں پارٹی سسٹم کی گنجائش نہیں ہوگی۔ پارلیمنٹ کے ممبران کسی پارٹی کے ممبر نہ ہوں گے اور نہ پارلیمنٹ کے اندر ان کے لئے گروہ بندی کرنا جائز ہوگا۔ مرکزی پارلیمنٹ کی نامزد کردہ ایک اسٹینڈنگ کمیٹی مستقلاً موجود رہے گی۔ یہ کمیٹی حکومت کی جس کارروائی کو غیر اسلامی پائے اُسے روک دینے کے بعد پورا قضیہ پارلیمنٹ کے سامنے رکھ دے گی اور پارلیمنٹ کا فیصلہ صدر کے لئے واجب القبول ہوگا۔ کسی شخص کو صدر کے انتخاب کے لئے اُمیدوار بننے کی اجازت نہ ہوگی۔ صدر قابلِ عزل ہوگا۔ صدر کی مدد کے لئے مشیروں کی ایک کونسل ہوگی۔ پاکستان کی ولایت مشرقی اور ولایت غربی کے لئے صدر اپنے دو نائب مقرر کرے گا۔ صدر اور اس کے دونوں نائب اپنے لئے ایک ایک غیر مسلم مشیر مقرر کریں گے۔ ریاست کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ ہر مسلمان کو قرآن کی زبان سکھانے کا انتظام کرے۔ ریاست اور کاشت کار کے درمیان کوئی تیسرا واسطہ نہ ہوگا۔ حکومت شریعت کے حرام کردہ ذرائع سے کوئی آمدنی حاصل نہ کرے گی۔ حکومت معذور شہریوں کی کفیل ہوگی۔ ریاست کی پالیسی، وطنیت اور قومیت کے مغربی اور غیر اسلامی تصورات سے بالاتر رہے گی۔ مسلم ممالک کے ساتھ برادرانہ تعلقات رکھنے کے لئے پاسپورٹ، نباد لے اور ٹیرف کی پابندیاں اڑادی جائیں گی نیز ایک اسلامک انٹرنیشنل کونسل بنائی جائے گی

ان اشارات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس دستوری خاکے کا مزاج کیا ہے۔

**دستور پاکستان** مرتبہ:۔ ادارۂ طلوعِ اسلام۔ کراچی۔ ناشر:۔ میاں محمد امین الدین صاحب فیض باغ روڈ۔ لاہور۔ (قیمت نامعلوم)

اس پمفلٹ میں ایک ایسا دستوری خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جو نبی صلعم اور آپ کے خلفائے راشدین سے کسی طرح کا استفادہ کئے بغیر "خالص قرآنی" نوعیت کا ہے۔ دستوری خاکہ ہی پیش نہیں کیا گیا بلکہ ایک نئی قرار دادِ مقاصد کا "قرآنی مسودہ" بھی درج کیا گیا ہے۔ اسلام اور دستوریات سے جو مذاق اس خاکے میں کیا گیا ہے، اس پر کسی لمبے چوڑے تبصرے کی گستاخی کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

## وحی منظوم

از: علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم۔

شائع کردہ، مکتبۂ پرچم، پرچم اسٹریٹ، حسن علی آفندی روڈ۔ کراچی

ترجمہ وتفسیر قرآن کے میدان میں قرونِ اولیٰ سے لے کر اب تک برابر کاوشیں کی جارہی ہیں اور کی جاتی رہیں گی۔ مختلف اسالیب سے، مختلف پہلوؤں سے اور مختلف طریقوں سے اس "ہدایت نامۂ انسانیت" کے حقائق و معارف کو امت کے دماغوں نے واضح کرنے کی جو سعی کی ہے وہ ہمیشہ ناتمام ہی رہے گی کیوں کہ اس سمندر کی کوئی تھاہ نہیں ہے۔

لفظی ترجمے، بامحاورہ ترجمے اور ترجمانی کے مختلف انداز اختیار کر کے قرآن کے علما نے اپنے اپنے زمانوں میں قرآن کی خدمت کی ہے۔ ازانجملہ بعض لوگ قرآن میں "فنی صناعت" دکھانے کی طرف بھی متوجہ ہوئے ہیں۔ مثلاً قرآن کی بے نقط تفسیر بھی لکھی گئی ہے۔ اسی طرح متعدد شعراء نے قرآن کا منظوم ترجمہ پیش کرنے کے لئے محنتیں کی ہیں۔

ہمارے سامنے وحی منظوم کے نام سے اس وقت علامہ سیماب مرحوم کا لکھا ہوا انیسویں پارے کا ترجمہ ہے۔ جو آرٹ پیپر پر رنگین چھپائی سے پیش کیا گیا ہے۔

کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ سیماب دنیائے شعر وسخن میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں، اور کون یہ نہیں جانتا کہ انہوں نے ہر طرح کے موضوعات اور ہر طرح کے میدان ہائے فکر کو اپنی جولانگاہ بنایا ہے اور پھر جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کی قادر الکلامی پر ایک روشن شہادت ہے۔ اور کون یہ بدگمانی کر سکتا ہے کہ قرآن کی ترجمانی کرتے ہوئے انہوں نے نیت کی پاکیزگی کے ساتھ پورے پورے احساسِ ذمہ داری اور پورے پورے فنی اہتمام سے کام نہ لیا ہوگا۔ یہ مرحوم کی احتیاط پسندی ہے کہ اپنے منظوم ترجمے کو زیادہ تر لفظی

ترجمے کی حد میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔

لیکن اگر قرآن شعر کے پیرایے میں آکر زیادہ موثر ہو سکتا تو یقیناً اس کا نزول نثر میں نہ ہوتا۔ قرآن بہ یک وقت ایک دعوت انقلاب، ایک فلسفۂ حیات، ایک نظامِ اخلاق و معاشرت اور ایک ضابطۂ قانونی پر مشتمل ہے، اور اپنے موضوعات کے لحاظ سے ایسی چیز نہیں ہے کہ شعر کے سانچے میں ڈھل کر اپنے مقصد کو پورا کر سکے! قرآن کے مزاج اور شعر کے مزاج میں بڑا بُعد ہے! اگر قرآن کے مزاج اور اس کے مقصد کو مقدم رکھا جائے تو شعر کے تقاضے مجروح ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور شعر کے مزاج کو زیادہ اہمیت دی جائے تو قرآن کو اپنے مزاج پر قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ آپ کتنے ہی محتاط ہوں شعر کے وزن اور اس کے قافیے کا اہتمام کرتے ہوئے اگر آپ لفظی و معنوی تحریف سے دامن بچا بھی نکلیں تو بھی اتنا تصرف ناگزیر ہے کہ قرآن نے جس چیز پر زور دیا تھا آپ کے ہاں وہ نرم انداز میں نظم ہو، اور قرآن نے جہاں زور نہیں دیا تھا وہاں بلا ضرورت زور پیدا ہو جائے۔ کہیں غیر ضروری الفاظ کا اضافہ اور کہیں سے ضروری الفاظ کا سقوط قرآن کی فطری فصاحت و بلاغت کو نقصان پہنچائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ایک مسلم شاعر کے لئے خدمتِ قرآن کا زیادہ سے زیادہ میدان یہ ہو سکتا ہے کہ وہ قرآن کی دعوت اور قرآن کی حکمت کو سمجھ کر اور اس کو پوری طرح اپنا کر مختلف موضوعات کے تحت شعر کے پیرایے میں پیش کرے۔ اگر کوئی اس سے بھی آگے بڑھنا چاہتا ہو تو وہ یہ کر سکتا ہے کہ کسی سورت کو پڑھ کر جو تاثرات وہ اخذ کر سکا ہو، ان کو بالکل اپنے الفاظ میں لاکر نظم کے سانچے میں ڈھال دے۔ لیکن قرآن کا منظوم ترجمہ جتنی مفید خدمت ہو سکتی ہے، اتنی ہی خطرناک بھی ہے!

خود سیماب مرحوم جیسے قادر الکلام شاعر کا یہ منظوم ترجمہ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ مرحوم نے ترجمہ کرنے میں جس احتیاط سے کام لیا ہے، اس نے کم سے کم منظوم ترجمے میں شعریت تو پیدا ہونے نہیں دی۔ پھر بسا اوقات ایک نئی بات جو ایک شعر کے مصرع ثانی سے شروع ہوتی ہے وہ دوسرے شعر کے مصرع اول کے نصف ٹکڑے میں آتی ہے اور دوسرے نصف ٹکڑے سے ایک نیا فقرہ شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بعض مواقع پر قرآن نے جس چیز پر زور دیا تھا وہ اپنی جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ چلا گیا ہے یا سرے سے غائب ہو گیا ہے۔

علاوہ بریں بعض اور چیزیں جو کھٹکتی ہیں وہ یہ ہیں:

"ایاک نعبد" کا مفہوم "بندگی" کا لفظ اپنے مروجہ معنوں میں ادا کرنے سے قاصر ہے۔ سورۂ کافرون در حقیقت "سورۂ کشمکش" ہے، لیکن بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح سیماب مرحوم نے بھی ترجمہ ایسا کیا ہے کہ یہ "سورۂ رواداری" بن کر رہ گیا ہے۔ مختلف مقامات پر "کلا" کا ترجمہ "کچھ نہیں!" کیا گیا ہے، حالانکہ ہونا چاہیے "ہرگز نہیں!" یہ کلمہ ہمیشہ کسی چیز کی تردید کرنے کے لئے آتا ہے اور بسا اوقات وہ چیز کلامِ ماسبق میں محذوف کر دی جاتی ہے جبکہ وہ نزولِ کلام کے وقت ماحول میں نمایاں طور پر موجود ہو۔ "ہرگز نہیں" کی جگہ اردو محاورے کے مطابق "جی نہیں!" بھی مفہوم دے جاتا ہے۔ سورۂ تکاثر میں لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ کا ترجمہ "پوچھیں گے اس دن حقیقت نعمتوں کی تم سے ہم" اصل مدعا سے ہٹ گیا ہے۔ حقیقت پوچھنے کا یہاں کوئی محل نہیں، بات ہے حساب طلب کرنے کی!

سورۂ بینہ میں "مخلصین له الدین حنفاء" کا مدعا تو ترجمہ میں آیا ہے مگر زور جس بات پر تھا وہ باقی نہیں رہا:-

حالانکہ حکم اور کچھ ان کو نہ تھا اس کے سوا یوں کریں وہ بندگی اللہ کی (صبح و مسا)،
کہ وہ ہو خالص اسی کی بندگی یکسوئی سے اور کریں قائم نماز اور دیں زکوٰۃ (اسکے لئے)،

سورۂ علق میں "الذی علم بالقلم" کا یہ ترجمہ کہ "وہ سکھایا ہے قلم سے جس نے علم (اسکے سوا)" قابلِ غور ہے۔ ہماری رائے میں "اس کے سوا" کے الفاظ سے مدعا بالکل دوسرے راستے پر پڑ گیا ہے۔ اصل سورۃ میں جس علم کے لئے "اقرأ" کا حکم دیا جا رہا تھا بات اسی کی چل رہی ہے۔

سورۂ انشراح میں "ورفعنا لك ذكرك" کا مفہوم صحیح ادا نہیں ہو سکا: "اور تمہارے ذکر کو دیں رفعتیں (ہر ذکر پر)"۔ رفعِ ذکر کا مفہوم ہے کسی کا چرچا عام کر دینا! اسی طرح سورۂ ضحیٰ میں "وللآخرة خير لك من الاولیٰ" میں تقابل دنیا و آخرت کے درمیان نہیں، بلکہ سلسلۂ کلام صاف بتا رہا ہے کہ گفتگو تحریکِ نبوی کے ابتدائے کار کی اور اس کے مستقبل کی ہے۔

هل فی ذلك قسم لذی حجر؟ (الفجر)، کے زوردار استفہامیہ انداز سے قطع نظر کر کے ترجمہ یوں کیا گیا ہے: "ان میں کافی قسمیں ہیں اربابِ دانش کے لئے!" "وما نقموا منهم ...." (البروج) کے لفظ انتقام کا مفہوم "عوض لینے" سے ادا نہیں ہوتا۔

شعری پابندیوں کی وجہ سے ترجمہ میں جو جھول رہ ہی جاتا تھا وہ تو ہے، لیکن وحیٔ منظوم کا جو پارہ ہمارے سامنے ہے اسے دیکھ کر اطمینان ہوا کہ سیماب مرحوم دورِ حاضر کے تفسیری فتنوں سے بچے ہوئے ہیں۔ قرآن کو "شاعر" ہونے کے باوجود انہوں نے اپنا کھلونا نہیں بنایا۔

# رسائل ومسائل

از

## سید ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتاب مولانا مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن میں اسی عنوان کے تحت وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کا حل موجود ہے اس وجہ سے ان مضامین میں مولانا نے ہر طرح کے سوالات کے جوابات قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت مدلل اور مفصل طریق پر دیدئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے جاذبیت کی حامل ہوگی۔

موضوعات مندرجہ ذیل ہیں

| | | |
|---|---|---|
| تفسیر آیات و تاویل احادیث | (۱۶) | مسائل کے جوابات |
| فقہی مسائل | (۳۴) | ,, |
| خلافیات | (۱۵) | ,, |
| عام مسائل | (۷) | ,, |
| معاشی مسائل | (۱۵) | ,, |
| سیاسی مسائل | (۱۰) | ,, |

ضخامت ۵۲۸ صفحات قیمت مجلد مع گرد پوش پانچ روپے چار آنے

اپنے شہر کے کتب فروشوں    مقامی جماعت اسلامی کے مکتبوں

یا

**مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان**

اچھرہ۔ لاہور سے طلب کیجئے

# تفہیمات حصہ دوم

از

## مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

جس کا ایک عرصے سے انتظار تھا اب پیش کی جا رہی ہے

زمانۂ حاضرہ کے دماغوں میں اسلام کے مبادی کو مستحکم کرنے اور اسکے تقاضوں کی تکمیل کے لئے عملی روح کو بیدار کرنے کے لئے مولانا مودودی کی تالیفات کو جو اہمیت حاصل ہے ، محتاج بیان نہیں۔

## جماعت اسلامی کے لٹریچر نے

نہ صرف پاکستان و ہندوستان کے مسلمانوں ، بلکہ پورے عالم اسلامی کے مسلمانوں کو اسلام کی عالمگیر انقلابی تحریک کے لئے بیدار اور تیار کرنے کا کام کیا ہے۔ کر رہا ہے ، اور کرتا رہے گا۔ انشاءاللہ۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اس میں جن اہم اور معرکۃالارا مسائل پر
گفتگو کی گئی ہے ان میں سے چند یہ ہیں

- قرآن اپنے لانے والے کو کس رنگ میں پیش کرتا ہے
- حقیقت جن
- معنی خلافت
- فتنہ تکفیر
- قربانی پر منکرین حدیث کا حملہ
- ہیگل اور مارکس کا فلسفہ تاریخ
- ڈارون کا نظریہ ارتقا
- لباس کا مسئلہ
- غلامی کا مسئلہ
- نماز میں آلہ مکبرالصوت کا استعمال

ضخامت ($\frac{20\times 26}{8}$) ۳۳۶ صفحات قیمت سات روپے صرف

## مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ - لاہور

سرورق رہبر پرنٹنگ پریس - بل روڈ ، لاہور میں چھپا